دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک کا علمی و دینی مجلہ

ماہنامہ

الحق

زیر سرپرستی

شیخ الحدیث حضرۃ مولانا عبدالحق بانی و مہتمم دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک پشاور

مغربی پاکستان

لدعوة الحق

قرآن و سنّت کی تعلیمات کا علمبردار

فون نمبر دارالعلوم - ۴   فون نمبر دھالکش - ۲

ماہنامہ **الحق** اکوڑہ خٹک

جلد : ۶   رجب المرجب - ۱۳۹۱ھ

شمارہ : ۱۲   ستمبر - ۱۹۷۱ء

مدیر ـــــــــ سمیع الحق

اس شمارے میں

★

بدل اشتراک

مغربی اور مشرقی پاکستان سے سالانہ ۸/ روپے ، فی پرچہ ۷۰ پیسے
غیر ممالک بحری ڈاک ایک پونڈ ، غیر ممالک ہوائی ڈاک دو پونڈ

سمیع الحق استاد دارالعلوم حقانیہ طابع و ناشر نے منظور عام پریس
پشاور سے چھپوا کر دفتر الحق دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک سے
شائع کیا

(پرنٹر محمد شریف)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ آغاز

ہمارا نظام دعوت و اصلاح امت ارباب فکر و دانش اور اصحاب بصیرت کی نہایت گہری سوچ و بچار کا مستحق ہے۔ بلاشبہ اب تک دینی اقدار اور اسلامی روایات کی جڑیں برّصغیر میں بہ نسبت دیگر اسلامی ممالک کے کچھ گہری اور مضبوط رہیں، مگر یہ بات رسمی انجمنوں، اداروں اور جماعتوں یا تنظیموں سے زیادہ اصحاب دعوت و عزیمت کے سوز دروں، جذبات اخلاص قوت اور جوشِ عمل، پاکیزگیٔ کردار کی منت پذیر رہی۔ اس وقت اخلاقی اور معاشرتی اصلاح کے لئے رسمی طور طریقوں کی نہایت فراوانی ہے۔ لٹریچر کا سلسلہ پورے عالمِ اسلام میں اتنا کبھی نہیں رہا، جتنا اب ہے۔ صرف عرب ممالک سے آئے دن نکلنے والی مطبوعات وہاں کے پیٹرول سے زیادہ اُبل اُبل کر دنیا میں پھیل رہے ہیں۔ صحائف اور مجلّات کی بہتات ہے، ایک سے ایک بڑھ کر خطیب اور واعظ زور خطابت دکھا رہا ہے۔ دینی مدارس اتنے کبھی نہ تھے جتنے آج ہیں۔ جماعتوں اور تنظیموں کا دور دورہ ہے۔ گلی گلی اصلاحی اداروں، اور سماجی انجمنوں سے آباد ہے۔ زبانی حد تک راعی سے لیکر رعیت سب اسلام کی حمد و ستائش میں رطب اللسان ہیں۔ تحقیق ریسرچ کے طویل الذیل منصوبوں کی بھی کمی نہیں، اور اس میں شک نہیں کہ اس تمام جہاد و جہد کے اثرات کچھ نہ کچھ ظاہر بھی ہو رہے ہیں اور اپنی جگہ ہر چیز کی افادیت مسلم ہے۔ مگر ان تمام مظاہر اصلاح اور رسومِ دعوت کے باوجود نتائج نہایت بھیانک شکل میں آرہے ہیں۔ خرابی بھلائی پر اور بدی، نیکی پر غالب آتی جارہی ہے۔ معاشرہ کی گاڑی عقائد اخلاق اور آداب معاشرت کے لحاظ سے منزلِ مقصود کو گم کر چکی ہے اور ہماری یہ تمام کد و کاوش مادیت اور بے دینی کے طوفان کے سامنے تنکوں کا ڈھیر ثابت ہو رہی ہے۔ اس لئے لازمی طور پر یہ تمام امور امت کے ہر جیدہ دماغ اور دلِ بیدار کے لئے سوچنے کے ہیں۔ خرابیوں کا سرچشمہ کیا ہے؟ اگر اسے متعین کیا جائے اور پھر دعوتی کام کو اس کے مطابق مرتب کر لیا جائے تو کام کے نتائج ایسے نہ ہوں ۔۔۔۔

اگر بنظرِ غائر مطالعہ کیا جائے تو ہمارے تمام تعلیمی، دعوتی اور تبلیغی کام ضعف و اضمحلال کی طرف جارہے ہیں، ان سب چیزوں پر کسی ایک فرصت میں نہ تو بحث کی جاسکتی ہے، اور نہ

ایک کم سواد کی تنگیٔ داماں اس کی متحمل ہو سکتی ہے۔ افادیت، اہمیت، اور امت پر پچھلی چند صدیوں میں نہایت گہرے اور دوررس اثرات چھوڑنے کے لحاظ سے خالص اللہ کے توکل پر چلنے والے دینی مدارس پہلے نمبر پر آتے ہیں۔

اس لحاظ سے اسکی موجودہ حالت کیا ہے۔ اس سلسلہ میں معزز معاصر البلاغ کراچی نے تازہ اداریہ میں اپنے نگارشات قلمبند کرتے ہوئے بجا طور پر بڑے اہم سوالات اٹھاتے ہیں۔ چونکہ الحق کا تعلق بھی ایک دینی مدرسہ سے ہے اور ان تاثرات کو ہم اپنے دل کی ترجمانی سمجھتے ہیں۔ اس لئے اپنے حلقۂ قارئین کے اصحاب فکر و بصیرت (خواہ ان کا تعلق قدیم سے ہے یا جدید سے) اور خاص طور سے ارباب مدارس عربیہ کی توجہ بھی ان سوالات کیطرف مبذول کراتے ہوئے ایک اہم دینی ضرورت پہ اظہار خیال کی دعوت دیتے ہیں:

"۱۔ ایک عام تاثر یہ ہے کہ ہماری موجودہ دینی درسگاہوں سے مؤثر علمی و دینی شخصیتوں کی تیاری تقریباً بند ہو رہی ہے۔ جناب کی نظر میں اس کے اسباب کیا ہیں۔؟

۲۔ موجودہ دینی مدارس کو دوبارہ مردم خیز اور امت کے لئے زیادہ نفع بخش بنانے کیلئے کون سے اقدامات آپ کی نظر میں ضروری ہیں۔

۳۔ محسوس یہ ہوتا ہے کہ ہماری دینی درسگاہوں میں تعلیم و تعلم کا اصل مقصد نگاہوں سے اوجھل ہوتا جا رہا ہے۔ براہ کرم نشاندہی فرمادیں کہ آپ کی نظر میں یہ مقصد کیا ہے۔ اور اہل مدارس میں اس کا استحضار کیونکر پیدا کیا جا سکتا ہے، جو ان کے فکر و عمل پر اثر انداز ہو سکیں۔"

مدارس عربیہ کے سلسلہ میں یہ چند ایسے سوالات ہیں جن سے صرف نظر کرنا اور انہیں اپنے شبانہ روز غور و فکر کا محور نہ بنانا، پوری ملت کے دینی، علمی اور فکری ضعف و اضمحلال سے بے پروائی برتنے کے مترادف ہے، پچھلی چند صدیوں سے یہی مدارس اور آزاد دینی تعلیم ہی زیادہ تر ہماری حیات جاودانی کے سرچشمے بنے رہے، کارگاہ حیات میں ان کی حیثیت انسانی فیکٹریوں کی رہی اور یہ مدارس علوم نبوت کا ایسا پاور ہاؤس ثابت ہوئے جس کا ایک سرا نبوت محمدی اور دوسرا سرا ملت محمدی سے وابستہ رہا سلسلہ اس کے ذریعہ ملت کی پژمردہ رگوں میں ایمان و یقین کی نئی حرارت دوڑتی رہی اور اسکی ضوٗ افشانی سے الحاد دہریت اور فاسد اعمال و عقائد کی ظلمتیں کافور ہوتی رہیں۔ ان مدارس سے نکلنے والوں میں بہت سی ایسی عبقری شخصیتیں تھیں جن میں ایک ایک کبھی کبھی پوری ملت پر بھاری ہو جاتی اور آج مدارس کے اندرونی ماحول، خارجی اثرات، تربیت اخلاق، علمی رسوخ، کردار اور عمل کی بلندی، مقصد سے شیفتگی، اساتذہ اور طلبہ کے

باہمی مخلصانہ روابط، غرض ہر لحاظ سے یہ مدارس اپنی حالت پہ نہیں ہیں، جبکہ نئے حالات کی بنا پر مدارس اور ان میں ایسی چیزوں کی اہمیت رگِ جاں سے بھی بڑھ چکی ہے۔ اس لئے تمام اہلِ علم اور اصحابِ دل حضرات کا اس ضعف و تنزل کے اسباب کی نشاندہی کر کے تدابیرِ اصلاح پر توجہ دینا دین کی ایک اہم پکار پر لبیک کہنا ہوگا —— یہ تو مدارس کا تربیتی پہلو تھا۔

نظامِ تربیت کے علاوہ نظامِ تعلیم اور نصابِ تعلیم بھی مدتوں سے توجہ طلب مسئلہ ہے۔ بلاشبہ موجودہ درسِ نظامی نے اپنے عہد کے لحاظ سے ہمہ گیری اور رسوخ فی العلم اور اس سے زیادہ ماحول اور تربیت کی بدولت ملت کو نابغۂ روزگار افراد دیئے، مگر عہدِ جدید اور اس کا علمِ جدید اس نصاب کا دامن نہایت وسیع کرنے کا طلبگار ہے۔ بیسویں صدی نے نہ صرف دیگر علوم بلکہ اسلامی علوم و فنون، تاریخ، اسلامی فلسفہ، فقہ اور قانون سازی، اسلامی علم الکلام عمرانیات، لسانیات، سیاسیات، اقتصادیات، ہر چیز کے متعلق بحث و استدلال، غور و فکر اور مطالعہ و تحقیق کے نئے گوشے پیدا کر کے تمام زاویے اور طور طریقے کافی حد تک بدل دیئے ہیں۔ پھر اتنے ہمہ گیر اور شاخ در شاخ کہ جب تک کوئی عالم ان سے پوری مناسبت پیدا نہ کرے، وہ جدید علمی دنیا کا پورے شرحِ صدر کے ساتھ چیلنج قبول نہیں کر سکتا۔ اور یہ مناسبت صرف موجودہ نصاب سے پیدا ہونی ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ تاریخ اب ایک منضبط سائنس ہے۔ جغرافیہ علم کی سینکڑوں شاخوں کو اپنے اندر سمیٹ چکا ہے۔ ادب کا میدان علم و ثقافت کے تمام اہم شعبوں پر حاوی ہو چکا ہے۔ جدید ادبِ عربی تحریر و تقریر ہر پہلو سے توجہ طلب بن گیا ہے۔ ریاضی علوم اور طبیعیات، ثریٰ سے ثریا تک پہنچ چکے ہیں، منطق، نئی ریسرچ اور بحث و استدلال کی شکل میں مراحلِ تکمیل کو چھو رہی ہے۔ فلسفہ کے کئی مسلمات، مشاہدہ اور تحقیق سے غلط ثابت ہو چکے ہیں۔ نئے مسلمہ نظریاتی اصول بھی آئے دن بدلتے رہتے ہیں۔ پھر اسلامی علوم و آثار پہ کہاں کہاں سے گولہ باری ہو رہی ہے۔ اور کن حربوں سے کام لیا جاتا ہے۔ استشراق کے پردہ میں ایک مستقل علمی دنیا اسلام اور اسلامی علوم و شخصیات کو مشقِ ستم بنائے ہوئے ہیں۔ قانون کی تدوین و ترتیب اقوامِ عالم میں ایک مستقل فن بن چکا ہے —— الغرض اس صدی کے علمی تقاضے، علمی زبان، علمی طریقِ کار گویا ہر چیز کہاں سے کہاں پہنچ چکی ہے۔ اسلام اور اس کے اصول ابدی اور غیر متبدل ہیں، نہ تحریف کے روادار نہ ترمیم کے، اور نہ تجدد کے۔ مگر علمائے اسلام کو یہ شرابِ کہنہ جامِ نو میں پیش کرنے کی اہلیت و صلاحیت بہم پہنچانی ہے۔ اس لئے کہ اسلام تو عیسائیت کی طرح میدان سے ہٹ کر عزلت نشینی کو غنیمت نہیں سمجھتا، وہ تو

جامع کامل دین، قوت مقابلہ سے بھرپور اور ہر دور میں نئے جوش اور ولولہ سے معمور رہا ہے۔ اور آنکھیں ملا کر ہر دور کے افکار و نظریات کا چیلنج قبول کرتا چلا آیا ہے۔ اس لئے آج بھی ضرورت ہے کہ علماء کرام اور ہمارے علمی ادارے جدید آلات و وسائل اور علمی اوزار حرب و ضرب سے پوری طرح لیس ہو کر نئے تقاضوں کا سامنا کر سکیں۔ ہمیں ہر دور میں اللہ نے ابو حنیفہؒ، احمد بن حنبلؒ، غزالیؒ، رازیؒ، ابن تیمیہؒ، رومیؒ، ابن رشدؒ، شاہ ولی اللہؒ، محمد قاسم نانوتویؒ جیسے اہل فکر و نظر دئے جنکی بدولت اسلام آج تک زندہ و تابندہ رہا۔ ضرورت ہے کہ نیا دور بھی اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کر کے یہ امانتِ عظمیٰ پچھلے دور سے بڑھ کر جوش و خروش اور شان بان کے ساتھ اگلی نسلوں تک پہنچا سکے ——— مقابلہ شدید تر ہے اور ہر آنے والی گھڑی وقت کی نزاکتوں میں اضافہ کر رہی ہے جنگ کا محاذ ہمہ گیر ہوتا جا رہا ہے۔ علمی و فکری لحاظ سے نیا سے نیا اسلحہ میدان میں آ رہا ہے۔ اور قرآنِ کریم واعدوا لھم ما استطعتم من قوۃ کی صورت میں پکار پکار کر دعوتِ تیاری دے رہا ہے۔ الغرض نصاب کے سلسلہ میں بڑی وسعت نظر کے ساتھ جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ تعلیم کی کل مدت کتنی ہونی چاہئے، اس مدت کو کتنے حصوں میں کسطرح تقسیم کیا جائے، اہم اور لازمی مضامین اور اختیاری مضامین کا تعین اور پھر طریقۂ تعلیم کیساتھ مطالعہ، تصنیف و تالیف، موثر ترین دعوت اور اس کا طریق کار۔ الغرض صدہا گوشے ہیں جو بحث و تمحیص کے مستحق ہیں۔

اسے حسن اتفاق کہئے یا البلاغ کے اداریہ کے ساتھ توارد فکر کہ علمی و فکری زندگی کے بارہ میں اکابر علماء اور چیدہ چیدہ اربابِ دانش کے تجربات و تاثرات سامنے لانے کے سلسلہ میں الحق نے بھی ایک سوالنامہ روانہ کیا ہے۔ بزرگوں نے ان سوالات کے جوابات دینے کی زحمت فرمائی تو اس سے بھی کافی حد تک موجودہ تعلیمی، مطالعاتی اور تربیتی امور پر روشنی پڑ سکے گی۔ اس سلسلہ میں قارئین حضرات سے بھی التماس ہے کہ کوئی مفید تجویز اور کام کی بات ذہن میں آئے تو تحریر فرمادیں۔ ایسی تجاویز، آراء، احساسات، اور تبادلۂ خیالات، نئے خطوط، اور نقوش اجاگر کرنے میں انشاءاللہ ممد ثابت ہو سکیں گے۔ لعل اللہ یحدث بعد ذلک امرا:

۱۔ آپکو علمی زندگی میں کن کتابوں اور مصنفین نے متاثر کیا اور آپکی محسن کتابوں نے آپ پر کیا نقوش چھوڑے۔ ۲۔ ایسی کتابوں اور مصنفین کی خصوصیات۔ ۳۔ کن مجلات اور جرائد سے آپکو شغف رہا۔ موجودہ صحافت میں کون سے جرائد آپکے معیار پر پورے اترتے ہیں۔ ۴۔ آپنے تعلیمی زندگی میں کن اساتذہ اور درسگاہوں سے خاص اثرات لئے، ایسے اساتذہ اور درسگاہوں کے امتیازی اوصاف جن سے طلبہ کی تعمیر و تربیت میں مدد ملی۔ ۵۔ اسوقت عالمِ اسلام کو جن جدید مسائل اور حوادث و نوازل کا سامنا ہے اس کیلئے قدیم یا معاصر اہل علم میں سے کن حضرات کی تصانیف کار آمد اور مفید ثابت ہو سکتی ہیں۔ ۶۔ علمی، فکری اور دینی محاذوں پر کئی فتنے، تحریفی، الحادی، اور تجددی رنگ میں (مثلاً انکارِ حدیث، عقلیت، اباحیت، تجدد، مغربیت، قادیانیت اور ماڈرنزم) مصروف ہیں۔ انکے سنجیدہ علمی احتساب میں کونسی کتابیں حق کے متلاشی نوجوان ذہن کی رہنمائی کر سکتی ہیں۔ ۷۔ موجودہ سائنسی اور معاشی مسائل میں کونسی کتابیں اسلام کی صحیح ترجمانی کرتی ہیں۔ ۸۔ مدارسِ عربیہ کے موجودہ نصاب میں وہ کونسی تبدیلیاں ہیں جو اسے مؤثر اور مفید تر بنا سکتی ہیں۔ ——— امید ہے اپنے مفید خیالات سے محروم نہیں کیا جائے گا۔ واللہ یقول الحق وھو یھدی السبیل۔

سمیع الحق

دعوات عبدیت حق — ارشادات حضرت شیخ الحدیث مولانا عبد الحق مدظلہ

ضبط و ترتیب : ادارہ الحق

حقوق العباد

(خطبہ جمعۃ المبارک ۴ جمادی الثانی ۱۳۹۱ھ ۲۷ اگست ۱۹۷۱ء)

★

خطبہ مسنونہ کے بعد ——— عن ابی ھریرۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال من نفس عن مسلم کربۃ من کرب الدنیا نفس اللہ عنہ کربۃ من کرب یوم القیامۃ ومن یسّر علی معسر فی الدنیا یسّر اللہ علیہ فی الدنیا والآخرۃ ومن ستر علی مسلم فی الدنیا ستر اللہ علیہ فی الدنیا والآخرۃ واللہ فی عون العبد ما کان العبد فی عون اخیہ ۔ (ترمذی جلد ثانی)

محترم بھائیو ! اسلام جسطرح حقوق اللہ ہمیں سکھاتا ہے کہ اللہ پہ ایمان لے آؤ اللہ خالق ہے ۔ تمام احسانات و انعامات اور تمام خزائن کا مالک ہے ۔ اور اس نے ہمارے اوپر فضل و کرم فرمایا ، تو اس پہ ایمان لانا ضروری ہے ۔ اسکی اطاعت اور فرمانبرداری اسی طریقہ پر فرض ہے ، جو سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا ۔ یہ فرض ہے اور لازمی ہے ۔ اور ہماری فلاح اور کامیابی اس میں ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کریں ۔ اور اگر ذرہ بھر بھی اس سے ہٹ گئے ، اور خواہشات کی پیروی کی تو نہ فلاح ہو گی نہ سعادت ، بلکہ دنیا و آخرت کا خسران ہوگا ——— تو گویا اسلام ہی حقوق اللہ سکھاتا ہے جن کی ادائیگی فرض ہے ۔ مثلاً پنج وقتہ نماز ، روزہ رکھنا ، حج کرنا ، زکوٰۃ دینا فرض ہے ۔ اس طرح بندوں کے بھی ایک دوسرے پر حقوق ہیں ۔ اور اللہ کے بندوں سے بھی ہمدردی کرنا لازمی ہے ۔ مگر آج ان حقوق سے بالکل بے پروائی برتی جارہی ہے ۔ دنیا ایک جہنم کدہ بنی ہوئی ہے ۔ ہر طرف زیادتی ، ظلم و تعدی ، حق تلفی اور لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم ہے ۔ قومی جنگ ، صوبائی جنگ ، انفرادی اور اجتماعی جنگ ہر طرف لڑائی ہی لڑائی ہے ۔ امن و سکون کی مقدار بہت کم رہ گئی ہے ۔ گویا آج کا انسان اس سے آگاہ ہی نہیں کہ ایک انسان کا دوسرے

انسان پر کیا حق ہے۔؟ اور اگر ہے تو شاید اسے شریعت کا جزو ہی نہیں سمجھتے، حالانکہ حقوق اللہ کی طرح بندوں کے حقوق کی ادائیگی بھی ایمان کا لازمی جزو ہے۔

عبداللہ بن سلام جو یہود کے بہت بڑے محقق عالم تھے اور مسلمان ہو گئے تھے۔ حضور اقدسؐ جب مدینہ تشریف لائے تو حضورؐ کا نورانی چہرہ دیکھ کر کہا کہ یہ شخص قطعاً جھوٹا نہیں، سچا ہے، نبی آخر الزمان ہے۔ آپ حضورؐ کی تشریف آوری کے وقت اپنی زمین پر کام کے لئے گئے تھے۔ جب معلوم ہوا کہ حضورؐ آچکے ہیں، تو دوڑ دوڑ کر آئے، حضورؐ کو مجلس میں بیٹھے دیکھا تو حضورؐ فرما رہے تھے: افشو السلام اے میری امت ایک دوسرے کو سلام کہو۔ السلام علیکم کتنا پیارا جملہ ہے جس میں سلامتی کی دعا ہے۔ السلامۃ نازلۃ من اللہ علیکم۔ تم پر دنیا و آخرت میں اللہ کی سلامتی ہو۔ یہ دین و دنیا، آل اولاد، مال و دولت جائیداد، تجارت زراعت، عزت و آبرو ہر چیز کی سلامتی کے لئے ہے۔ اور ترجیبی کلمات میں یہ جامعیت کہاں۔ ہمارے پٹھان بھائی کہتے ہیں "ترڑے مہ شئ" کہ اس کام میں گویا ہر دفت لگا رہ مگر ہاتھ کاوٹ نہ ہو۔ یہ تو ایک قسم کی بددعا ہے۔ مسلمانوں کو تو ہر حالت میں سلام ہی کے کلمات استعمال کرنے چاہئیں۔

یہی حال اور قوموں کے کلمات کا ہے۔ گڈ مارننگ، یا عربی میں صبحک اللہ بالخیر — امسالک اللہ بالخیر کا مطلب بھی صرف یہ ہے کہ تمہارا صبح کا وقت اچھا ہو یا تمہاری شام اچھی ہے۔ مگر السلام علیکم میں جو سلامتی ہے اس میں تمام اوقات اور تمام حالات کو شامل کیا گیا ہے — یعنی تمام نقائص، مصیبتوں، اور عیوب سے سلامتی۔

اسلام کی عجب شان ہے، ہر سنت اور طریقہ کتنا جامع اور بے مثال ہے — نام بھی مسلمان مذہب بھی اسلام، مسلم یعنی امن صلح اور سلامتی سے ماخوذ اور پہلی ہی ملاقات میں اسلام اور سلامتی کی تلقین۔ باپ ہو، بیٹا ہو۔ استاد ہو، شاگرد ہو، حاکم ہو، یا رعیت ہو۔ گھر میں بیوی ہو، سب کو السلام علیکم کہا کرو۔ گھر میں سلام کہنا متروک ہو چکا ہے۔ حالانکہ یہ بھی سنت ہے۔ گھر میں برکت ہو گی۔ ہمارے کچھ پٹھان بھائی گھر میں سلام کہنے میں عار محسوس کرتے ہیں۔ عوام تو دین سے کورے ہو گئے۔ بہر حال کھڑے بیٹھے ہر شخص کو سلام کہیں۔ اس لئے کہ یہ تو ہمارا ایک دوسرے سے پہلا معاہدہ ہے کہ میری طرف سے مجلس میں آنے پر تمہارے لئے سلامتی ہے، یعنی میں کوئی بدخواہ یا جاسوس یا مخبر نہیں ہوں۔ تمہارے خلاف شر و فساد نہیں کروں گا۔ — تو یہ ایک معاہدہ اور حلف وفاداری ہوا، اور اسلام نے باہمی معاشرت کا پہلا

سبق کتنا عمدہ دیا کہ آتے ہی وہ اعلان کرتا ہے کہ میری طرف سے تمہیں کسی قسم کی تکلیف نہ ہوگی، دو چار لمحے بیٹھنا بھی تمہاری خیر خواہی میں ہوگا۔ جاتے وقت پھر سلام کہتا ہے گویا جو باتیں مجلس سے مخصوص تھیں اس میں بد دیانتی نہ کروں گا۔ امانتِ مجلس کا لحاظ رکھوں گا ــــ تو آتے جاتے دونوں وقت وعدہ کیا کہ مجھ سے غیبت، چغلی یا بد خواہی کی توقع نہ کرنا، سامنے بھی اور پیچھے بھی سلامتی ہے تم پر ــــ

ــــ تو سارے دنیا کے مذاہب اور معاشرتی تحریکیں ایک طرف اور اسلام کے امن و سلامتی کی رعایت کے قوانین اور آداب ایک طرف ــــ ہاں سلام کے لئے بھی آداب ہیں بعض اوقات اس سے مخصوص ہیں خطبہ، اذان، نماز، تلاوت، یا دوسری اہم عبادت میں مشغول ہو تو فارغ ہونے تک سلام نہ کہو۔ ہر چیز کا ایک موقعہ ہوتا ہے۔ مگر عام اوقات اور حالات میں بڑے چھوٹے پر سلام پھیلا دو۔ تو جب ہم نے کسی سے ملتے ہی اسکی سلامتی کا عہد کیا تو پھر اُسے ہاتھ، پاؤں، زبان اور دیگر اعضا سے ضرر اور تکلیف پہنچانا کب جائز ہو سکتا ہے ــــ سلام کی رعایت لازمی ہوگی۔ صرف زبانی دعویٰ کافی نہیں بلکہ فرمایا: المسلم من سلم المسلمون من لسانہ ویدہ۔ مسلمان تو وہی شخص ہو سکتا ہے، جس کی زبان اور ہاتھ کے ضرر سے دوسرے مسلمان محفوظ ہوں ــــ تو صرف اسلام اور مسلمان کے نام کی رعایت اور نگہداشت ہی سے تمام خاندانی، ملکی اور انفرادی جھگڑے ختم ہو سکتے ہیں۔

حضورؐ نے فرمایا: المؤمن من امنہ الناس علی دماءھم واموالھم۔ مومن وہ ہے جس سے کسی کو بھی اپنے مال و جان کے بارہ میں خطرہ نہ ہو، کہ وہ چوری کریگا یا نقصان پہنچا دے گا۔ مؤمن کو کوئی گمشدہ چیز بھی مل جائے تو تین سال تک یا جب مالک کا اسے تلاش کرنے کا امکان ہو اس چیز کو حفاظت سے رکھے گا۔ اور مالک کو تلاش کرنے کی ذمہ داری بھی شارع نے اس پر ڈال دی۔ چوری اور ایمان اکھٹے نہیں ہو سکتے۔ لا یسرق السارق وھو مؤمن ولا یزنی الزانی وھو مومنٌ۔ چوری بھی کرے اور مومن بھی کہلائے۔ زنا بھی کرے اور مومن بھی کہلائے۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ خود حضورؐ نے امانت حقوق کا کیسا نمونہ پیش فرمایا۔ تیرہ برس تک اہلِ مکہ نے کتنی مصیبتیں پہنچائیں مذہبی منافرت میں کافر جان کے دشمن ہوگئے جس وقت گھر بار وطن سے نکالنے پر مجبور کیا تو حضورؐ کے پاس ہزاروں روپے اُن ہی لوگوں کے امانت رکھے ہوئے تھے۔ کفار کا یہ طریقہ تھا کہ کہیں جاتے وقت اپنی مال و دولت حضورؐ کے پاس امانت رکھ دیتے تھے، مال کے بارہ میں اوروں پر بھروسہ

نہیں تھا۔ دشمنی کے باوجود آپؐ پر اعتماد تھا۔ المؤمن من امنہ الناس ـــــ تو حضورؐ نے حضرت علی کو ادائیگی امانت ہی کیلئے چھوڑا کہ میرے بعد امانات پہنچا دیں۔ اور آپ نے دوسرے دن سب کو اپنی اپنی امانت سپرد کر دی۔ تو دشمن کے ساتھ بھی یہ معاملہ اور سلوک رہا۔

حضورؐ نے اس ارشاد میں مزید فرمایا: واطعموا الطعام۔ یعنی طعام کھلایا کرو۔ قربان جائیے حضورؐ اور صحابہ کرامؓ سے، کہ اس مسئلہ پر بھی کیسے کیسے عمل کر کے دکھائے۔ گرد و نواح کے ہزاروں مہاجر اللہ کی رضا کے لئے گھر بار چھوڑ کر مدینہ آئے۔ حضورؐ نے فرمایا: طعام الواحد یکفی الاثنین وطعام الاثنین یکفی الثلاث وطعام الثلاثۃ یکفی الاربع۔ جو کم کھائے ایک کھانے پر دو کفایت کر سکتے ہیں۔ زیادہ کھانے والا دو افراد اور اس سے زیادہ کھانے والا تین افراد کے کھانے میں شامل ہو جائے۔ انصار نے انہیں اپنے گھروں پہ جگہ روٹی سالن جائداد، تجارت سب کچھ میں شریک کر دیا۔ جتنی وسعت تھی اتنا ہی اوروں کو کھلایا، پلایا۔ حضرت عبدالرحمان بن عوف کو حضرت سعد نے پیشکش کی کہ میری ساری دولت برابر بانٹ لو۔ اور میری دو بیویوں میں سے جسکو چاہو طلاق دیکر تمہارے عقد میں دیدوں گا ـــــ آج بھی اگر ہمارے امراء اور اہل ثروت کی یہ حالت ہوتی تو بھوک کی وجہ سے شر و فساد کیوں پیدا ہوتا۔

آگے فرمایا حضورؐ نے: وصلوا الارحام۔ باہمی صلہ رحمی کرو۔ خیرات و صدقات کو دیا تو ایک حصہ اپنوں کو دیا تو ایک کے بدلے دو حصے اجر ملے گا۔ حضورؐ نے فرمایا کہ صلہ رحمی کرنے والا وہ نہیں جو صلہ رحمی کا بدلہ صلہ رحمی سے دیتا ہے۔ بلکہ رشتہ دار اگر قطع رحم بھی کرے تب بھی یہ صلہ رحمی کرتا رہے۔ فرمایا: لایدخل الجنۃ قاطع۔ قطع رحم کرنے والا جنّت میں داخل نہ ہوگا۔

آگے فرمایا: وصلوا باللیل والناس نیام۔ رات کو جب کہ لوگ سوئے ہوں تہجد کیا کرو۔ حضورؐ نے ایک اور موقع پر فرمایا کہ جنّت میں اونچے اونچے بنگلے ہیں، لعل و جواہر کی طرح شفاف، کہ اندر سے باہر اور باہر سے اندر سب کچھ نظر آتا ہے۔ یُریٰ ظاہرھا من باطنھا وباطنھا من ظاھرھا۔ ـــــ یہ کس لئے ہیں ـــــ؟ فرمایا: لمن الان الکلام۔ جو دوسروں کے ساتھ نرمی سے بات کرے۔ نہ کہ ایک بات اور دوسری لڑائی۔ مسلمان کا دل نرم گفتار سے خوش ہو جائے گا۔ سخت اور درشت لہجہ سے دلوں کو ٹھیس ہوتی ہے۔ اگر مجبوری بھی ہے تو نرمی سے معذرت کرے۔ واطعم الطعام اور اس جنّت کا مستحق وہ ہے جو لوگوں کو طعام کھلائے۔

حدیث کی تشریح | ابتداء میں جو حدیث سنائی گئی، اس میں حضور اقدسؐ نے حقوق العباد

اور مسلمانوں کے معاشرتی تعلقات کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے، اور امت کو ترغیب دی ہے۔ کہ اگر تم دنیا و آخرت میں اپنی تکالیف رفع کرنا چاہو تو اللہ کے بندوں سے دنیاوی تکلیف رفع کرو۔ فرمایا: من نفس عن مؤمن کربۃً من کرب الدنیا۔ الخ معمولی سی دنیاوی کوئی مصیبت بھی ہٹا دی تو اللہ اس سے آخرت کی مصیبت جو بہت بڑی اور غیر معمولی ہے ہٹا دے گا۔ پہلی کربۃً میں تنوین تحقیر اور دوسری میں تعظیم کے لئے ـــــ دنیا کی معمولی مصیبت کے بدلے قیامت کی عظیم مصیبت ـــــ اور یہاں ہٹانے والا انسان ہے جو عاجز اور کمزور ہے۔ اور بدلہ دینے والا مالک الملک ذوالجلال والاکرام ہے۔ دور ہونے والی مصیبت کربۃ آخرہ ہے۔

حضورؐ نے دوسری جگہ فرمایا: من ردّ من عرض اخیہ ردّ اللہ عن وجہہ النار یوم القیامۃ۔ کسی نے اگر اپنے مسلمان بھائی کی آبرو بچائی، دوسرا برا بھلا کہتا تھا تم نے منع کر دیا کہ کن دلائل سے یہ باتیں کرتے ہو یا کسی مسلمان کی لٹی ہوئی عزت اپنی جدوجہد سے واپس کر دی۔ تو اللہ تعالیٰ اس کا چہرہ جہنم کے عذاب سے بچا دے گا۔ ومن یسّر علی معسر فی الدنیا۔ الخ۔ اگر کسی تنگدست پر تم نے آسانی کر دی تو حق تعالیٰ دنیا و آخرت میں تمہارے اوپر آسانی کا معاملہ فرما دے گا کسی تنگدست نے تم سے قرض لیا تم نے معاف کر دیا، ڈھیل دیدی کہ کسی وقت یسر میں دیدینا، اس کے بدلے اللہ دنیا و آخرت کے امور سہل کر دے گا۔ ایک شخص مرنے کے بعد خداوند کریم کے حضور میں پیش ہوا، اسکی کوئی نیکی سوائے ایمان کے عمل نامہ میں نہ تھی۔ ہاں صرف ایک عمل اس کے پاس تھا کہ وہ تاجر تھا۔ اور قرض لینے والے تنگدستوں کو مہلت دیا کرتا تھا، یا ویسے ہی معاف کر دیتا۔ خداوند کریم نے اس عمل کے بدلے اسے معاف کر دیا۔

آگے فرمایا: من ستر علی مسلم فی الدنیا۔ الخ اگر کسی نے غریب کے ننگے بدن کو کپڑا پہنایا تو اللہ اسے جنت کی خلعت پہنا دے گا۔ یا کسی مسلمان کے عیوب کی پردہ پوشی کی اور نیت اصلاح کی تھی، تو علام الغیوب اس کے عیوب کو چھپا دے گا۔ آج ہم دوسروں کی پردہ دری کے درپے ہیں۔ اس لئے ہمارے عیوب بھی نمایاں ہیں، اگر ہم پردہ پوشی کرتے تو ہمارے عیوب پر بھی پردہ رہتا۔ مسلمان کو مسلمان کی آبرو پر دست اندازی نہیں کرنی چاہئے، بلکہ اس پر پردہ ڈالنا چاہئے۔ آج ہماری مجالس، اخبارات اور پورا پریس اور سیاسی محفلیں ایکدوسرے کی پردہ دری اور بے حرمتی سے بھری ہوئی ہیں۔ عیب اور کی اشاعت بڑھ چڑھ کر کی جاتی ہے۔ مسلمان کی شان تو یہ تھی۔ فرمایا حضورؐ نے: المسلم اخو المسلم لا یخونہ ولا یکذبہ ولا یخذلہ، کل المسلم

علی المسلم حرامٌ عرضہٗ ومالہٗ ودمہٗ۔ مسلمان مسلمان کا بھائی ہوتا ہے نہ اس سے خیانت کرتا ہے، نہ جھوٹ بولتا ہے نہ اسے رسوا کرتا ہے۔ مسلمان کو مسلمان کی عزت، و آبرو و مال اور جان سب حرام ہیں۔

الغرض اوروں کے عیوب پر پردہ ڈالنا چاہیے۔ حضرت ماعزؓ کو کسی نے زنا کے اعتراف کا مشورہ دیا تو حضورؐ نے فرمایا لو سترتہٗ علیہ لکان خیراً۔ حد کے قیام سے پردہ ڈالنا اچھا تھا۔ البتہ کسی تعصب، فرقہ بندی، پارٹی بازی اور اقرباء پروری کی وجہ سے عیوب میں تعاون کرنا اچھا نہیں۔ ولاتعاونوا علی الاثم والعدوان۔ اور ایسا کرنا اثم اور عدوان میں تعاون ہوگا اور اگر مقصد پردہ پوشی ہو تو بہت اچھا ہے۔ ایک شخص حیاء کی وجہ سے اپنا گناہ چھپانا چاہتا ہے جب بے پردہ ہوگیا اور معاشرہ میں بدنام ہوگیا تو وہ بیباک ہوکر سب کچھ کرنے لگے گا کہ عزت اور آبرو تو چلی گئی اب کیا شرم ہے اس کے علاوہ کسی کی پردہ دری میں اشاعت فاحشہ بھی ہے اس سے لوگوں کو بُرے اعمال وافعال کی ترغیب ہوتی ہے۔ حقوق العباد میں بھی فقہاء نے اتنی احتیاط برتی ہے کہ کسی کو چوری کرتے دیکھا۔ اب دوسرے کا مال اور حق ضائع ہوتا ہے۔ تو جب گواہی دینا چاہے تو بجائے چوری کے الفاظ کہنے کے یہ کہے کہ اخذ ھذا من ھذا عشرۃ دراھم۔ اس شخص نے فلاں سے دس روپے لئے اس طرح دوسرے کا حق بھی ضائع نہ ہوگا۔ اور اس کا عیب بھی چھپ کر وہ قطع ید سے بچ جائے گا۔ اگر کوئی عیب نمایاں اور ظاہر ہو اور اس سے اوروں کو تکلیف ہو رہی ہو تو اس کو ظاہر کرنا الگ بات ہے۔ الغرض کسی کی ستر پوشی کرنے پر اللہ اسکی ستر پوشی فرمائیں گے۔ اور اس کے ساتھ سرگوشی میں گفتگو فرماکر کہیں گے کہ آپ نے فلاں فلاں گناہ دنیا میں کئے تھے اور جہنم کے مستحق تھے مگر میں نے تجھے بخش دیا۔ اسی طرح دنیا میں بھی کسی کو تنبیہ کرنی ہو اور ہوسکے تو علیحدہ کرکے اسے سمجھا دیا جائے۔

آگے فرمایا: واللہ فی عون العبد مادام العبد فی عون اخیہ۔ کون ہے جو خداوند کریم کی امداد کا محتاج نہ ہو۔ ہم سب چاہتے ہیں کہ رب العزت ہماری امداد فرمائے۔ اس حدیث نے امداد کے حصول کا طریقہ بتلا دیا کہ جب بندہ اپنے بھائی کی مدد کے درپے ہوگا تو خداوند کریم اسکی مدد فرمائے گا۔ تم اوروں کے کام میں لگے رہو، دوسروں کی بگڑی بناؤ۔ رب العزت تمہارے کام غیب سے پورے کرے گا۔ ارحموا من فی الارض یرحمکم من فی السماء۔ تم زمین والوں پر رحم کرو آسمان والی ذات اللہ تمہارے اوپر رحم کرے گا۔ اللہ تعالیٰ نیکی کی سب کو توفیق دے۔ آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

جناب اختر راہی - ایم۔ اے

فلپائن بحرالکاہل کے چھوٹے بڑے سات ہزار جزائر پر مشتمل ملک ہے جو ساحلِ چین سے چھ سو میل جنوب کی طرف واقع ہے۔ سب سے بڑا جزیرہ لوزان ہے جس میں دارالحکومت منیلا واقع ہے۔ دوسرا بڑا جزیرہ منڈاناؤ ہے۔ جزائر فلپائن کی آبادی ایک تخمینے کے مطابق ۳۷ ملین ہے، جس میں سے تیس ملین عیسائی (زیادہ تر کیتھولک) ہیں۔ پانچ ملین کے لگ بھگ مسلمان ہیں اور باقی ماندہ آبادی وحشی قبائل اور دوسرے مذاہب کی پیروکار ہے۔

اسلام کی آمد: عہدِ قدیم میں جنوب مشرق کے سمندروں میں سونے کے جزیروں کے بارے میں کہانیاں اس قدر مشہور تھیں کہ ان دیومالائی افسانوں نے بطلیموس کے جغرافیے تک میں جگہ پالی۔ عرب تاجر ہندوستان اور چین کی آبادی سے ایسی کہانیاں سنتے تھے اور "جزیرۃ الذہب" کی تلاش میں اپنے بادبانی جہازوں کو بحرالکاہل میں ادھر اُدھر گھماتے تھے۔ آخر سماٹرا اور جاوا سے ہوتے ہوئے ان جزائر تک پہنچے۔ عربوں نے ان جزائر کو "جزائر واق واق" کا نام دیا ہے۔ کیونکہ ان پر کوئی "راجہ واکا" حکمران تھا۔

عرب تاجروں نے بغرضِ تجارت جزائر میں سکونت اختیار کر لی اور اپنے سیرت و کردار کے ذریعے مقامی آبادی میں اسلام کا پیغام پھیلانا شروع کر دیا۔ اہلِ وطن اسلام کے حلقے میں شامل ہونے لگے۔ مگر تاجروں نے اسلام کی آواز پہنچائی اور تربیت و تعلیم کی ذمہ داریاں صوفیائے کرام نے انجام دیں۔

۱۳۸۰ء میں ایک عرب مبلغ شریف مخدوم سولو (SULU) میں وارد ہوئے۔ ان کے لقب "مخدوم" سے واضح ہوتا ہے کہ وہ صوفی بزرگ تھے۔ اس دور میں اکابر صوفیاء اسی لقب

سے مشہور تھے۔ شریف مخدوم کی تبلیغی مساعی کامیاب رہی۔ انہوں نے اسلام کا جو ننھا منا پودا لگایا تھا اسے سماٹرا کے راجہ بگینڈہ (RAJA BAGINDA) کو سینچنے کا شرف حاصل ہوا جو دس سال بعد یعنی ۱۳۹۰ء میں وارد ہوا۔ راجہ بگینڈہ نے تبلیغی کوششوں میں نئی جان ڈال دی۔ اور اپنی صاحبزادی ایک ذی علم سیّد زادے ابوبکر نامی کے عقد میں دی۔ راجہ بگینڈہ کی نرینہ اولاد نہ تھی اور راجہ موصوف کے داماد ابوبکر وارث تاج و تخت ہوئے۔ ابوبکر نے اپنے لئے راجہ کی بجائے سلطان کا لقب اختیار کیا اور نظام حکومت اسلام کے سیاسی اصولوں کے مطابق ڈھال دیا۔ سلطان ابوبکر کا دور حکومت ۱۴۵۰ء سے ۱۴۸۰ء تک جاری رہا۔

ابوبکر کے دور حکومت میں جزیرہ نمائے ملایا کی جنوبی ریاست جہور (JOHOR) کا ایک تاجر شریف کابنگ سوان (SHARIF KABUNGSWAN) منڈا ناؤ میں کوٹا باٹو کے مقام پر اپنے کئی ساتھیوں سمیت سکونت پذیر ہوگیا۔ کابنگ سوان نے ایک مقامی عورت سے شادی کرلی۔ اور اسلامی تبلیغ کے کمربستہ ہوگیا۔

شریف مخدوم سے لیکر کابنگ سوان تک کی کوششوں سے فلپائن کی خاص آبادی نے اسلام قبول کرلیا اور کابنگ سوان کی سیاسی قوت کی بدولت اسلامی سلطنت کی سرحدیں وسیع ہوتی گئیں۔ آرنلڈ کے بیان کے مطابق کابنگ سوان کی سرگرمیاں پُرامن رہیں۔ مگر حصول قوت کے بعد انہوں نے ہمسایہ قبائل کو زیر کرلیا اور انہیں حلقۂ اسلام میں داخل کرلیا۔ آرنلڈ کا یہ بیان مغربی ذہنیت کا آئینہ دار ہے۔ جس کے مطابق یہی تصوّر کیا جاتا ہے۔ کہ اسلام تلوار سے پھیلا ہے۔

ہسپانیہ کا تسلّط | منڈا ناؤ اور سولو کی اسلامی سلطنتیں شمال اور مشرق کے جزائر میں پھیل رہی تھیں۔ کہ ہسپانوی جہازران فرڈیننڈ میگلن (FERDINAND MAGELLAN) نے دنیا کی تاریخ میں پہلی مرتبہ دنیا کے گرد چکر لگانے کی کوشش کی۔ ۱۶ مارچ ۱۵۲۱ء کو یہ بہادر مگر لالچی جہازران منڈا ناؤ کے قریب سیبو نامی جزیرے میں لنگر انداز ہوا۔ ان جزائر کی دولت نے جہازران کے قدم باندھ لئے اور یہیں کا ہو رہا۔ آخر مقامی آبادی سے لڑتے ہوئے مارا گیا۔ مگر جان دیکر ہسپانوی مستعمرین کے لئے ان جزائر کا دروازہ کھول دیا۔

اتفاق سے یہ وہی زمانہ تھا جب ہسپانویوں نے مسلمانوں پر تازہ تازہ فتح حاصل کی تھی۔ اور پوری دنیا پر اپنا جھنڈا لہرانے کی کوشش کر رہے تھے۔ انہوں نے یہاں بھی مسلمانوں کو ختم کرنے کے وہی حربے استعمال کئے جو ہسپانیہ میں کامیاب ثابت ہوچکے تھے۔ ہسپانویوں نے عیسائیت

کو جبر و تشدّد کے ذریعے عوام پر مسلّط کرنے کی کوشش کی۔ مسلمانوں کی نسبت استعماریوں کے وسائل بے پناہ تھے اور یہ وسائل عیسائیت کے پھیلانے کے لئے استعمال کر رہے تھے۔ تاہم مسلمانوں نے انیسویں صدی کے آخر تک استعماریوں کے سامنے ہتھیار نہ ڈالے۔ عیسائیت تمام مشنری سرگرمیوں اور ترغیب و تخویف کے باوجود کامیاب نہ ہو سکی۔ اس کے برعکس اسلام کا حلقہ وسیع ہوتا گیا۔ ہسپانویوں کے ظلم و تشدّد سے لوگ تنگ آکر منڈانا ناؤ میں پناہ لیتے اور اسلام قبول کر لیتے تھے۔

۱۵۴۳ء میں ان جزائر کا نام ہسپانیہ کے ظالم بادشاہ فلپ دوم کے نام پر فلپائن رکھا گیا۔ مسلمانوں نے استعماریوں کا مقابلہ کیا اور چار صدیوں تک اپنی آزادی کے لئے جانی و مالی قربانی دیتے رہے۔ مسلمانوں کی مزاحمت نے ہسپانیہ کو اس قدر کمزور کر دیا تھا کہ ۱۸۹۸ء کی جنگ میں ہسپانیہ کو امریکہ کے ہاتھوں شکست کھانی پڑی اور جزائر فلپائن ہسپانیہ کے تسلط سے نکل کر امریکہ کے قبضے میں چلے گئے۔

امریکی دور اقتدار امریکی حکومت نے ہسپانویوں کے برعکس پالیسی اختیار کی۔ جبر و تشدّد کے بجائے نظامِ تعلیم کو عیسائیت کی تبلیغ کا ذریعہ بنایا۔ مسلمانوں نے بھی معاندانہ رویہ رکھنے کی بجائے صلح جوئی کا راستہ اختیار کیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسلام کی تبلیغ رک گئی اور عیسائیت نہایت تیزی سے لوگوں کے دلوں میں راہ پا گئی۔

امریکی دورِ اقتدار میں عیسائی آبادی نے جدید نظامِ تعلیم کے مطابق تعلیم حاصل کی اور ملک کے اہم پیشوں پر قابض ہو گئے۔ تجارت، بنکاری اور ایسے ادارے مکمل طور پر عیسائی آبادی کے ہاتھ میں تھے۔ حکومت ان ہی کے ہاتھ میں تھی۔ اور مسلمان آبادی زیادہ تر کاشتکاروں اور مچھیروں پر مشتمل رہی۔

جنگِ عظیم اوّل اور جنگِ عظیم دوم نے استعماری طاقتوں کو ہلا ڈالا۔ ان سے جہاں برطانیہ متاثر ہوا۔ امریکہ بھی اس اثر سے نہ بچ سکا۔ چنانچہ ۱۹۴۶ء میں امریکی اقتدار ختم ہو گیا۔ نتیجے میں عیسائی اکثریت کی حکمرانی قائم ہو گئی۔ مسلمانوں کو ناقابلِ توجہ اقلیت قرار دیا گیا۔ تاریخی پس منظر اور جغرافیائی حالات کا تقاضا یہ تھا کہ فلپائن کو وحدانی مملکت کی بجائے وفاقی مملکت بنایا جاتا اور مسلمان آبادی والے جزائر کو داخلی خود مختاری حاصل ہوتی۔ مگر ایسا نہ کیا گیا۔

مسلمانوں کی تعلیم ہسپانوی دورِ حکومت میں مسلمان بدیشی حکمرانوں کے خلاف لڑتے

رہے اور ان کی مراعات سے کوئی فائدہ نہ اٹھایا جب کہ عیسائی ہم وطن ہسپانوی نظامِ تعلیم کو اختیار کر چکے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس دور میں حکومت کے اہم عہدوں پر عیسائی ہم وطن ہی فائز ہوئے۔ امریکی دورِ اقتدار میں ان عیسائی افسروں اور حکمرانوں نے مسلمانوں کی تعلیم کی طرف کوئی توجہ نہ دی مسلمانوں نے از خود تعلیمی ضرورتیں پوری کرنے کی کوشش کی مگر بے سود۔ ۱۹۴۶ء میں حصولِ آزادی کے بعد مسلمانوں کو اپنی اس خامی کا شدت سے احساس ہوا اور منڈاناؤ میں یونیورسٹی کے قیام کا مطالبہ شروع کیا تاکہ منڈاناؤ کے مسلمان زیورِ تعلیم سے آراستہ ہو سکیں۔

مسلمانوں کے شدید احتجاج کے بعد ۱۹۶۲ء میں منڈاناؤ میں ایک یونیورسٹی قائم کی گئی۔ یونیورسٹی کے قیام سے یہ امید پوری ہوتی دکھائی دی کہ غیر تعلیم یافتہ غریب مسلمان بھی اپنے ہم وطنوں کے پہلو بہ پہلو آ سکیں گے۔ مگر ع اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔

یونیورسٹی کی طرف سے ہر سال تین سو وظائف دئے جاتے ہیں جو منڈاناؤ، سولو اور پالان کے جزائر میں مقابلے کے امتحان میں اعلیٰ پوزیشن حاصل کرنے والوں کو ملتے ہیں۔ چونکہ مسلمان بنیادی طور پر پسماندہ ہیں۔ اور تعلیمی اخراجات برداشت نہیں کر سکتے اور مقابلے کے امتحانوں میں بھی نمایاں پوزیشن حاصل نہیں کر سکتے۔ اس لئے مسلمانوں کے لئے قائم کی گئی یونیورسٹی میں بھی ان کی تعلیم برائے نام ہی ہے۔ یونیورسٹی کے سٹاف اور طلبہ میں مسلمانوں کا تناسب صرف بیس فیصد ہے۔ فلپائن کے مسلمانوں کو خدشہ ہے کہ کہیں مراوی (MARAWI) شہر کہیں عیسائی اکثریت کا شہر ہی نہ بن جائے۔

بے اطمینانی کے اسباب: فلپائن میں مسلمانوں کی موجودہ بے اطمینانی اور مقامی آبادی کی کشمکش کا آغاز فلپائن دولتِ مشترکہ حکومت کے پہلے صدر مینول کیوزن (MANUEL QUEZON) کے دور میں شروع ہوا۔ جب اس نے لوزان (شمالی فلپائن) اور وسیاس (وسطی فلپائن) کی عیسائی آبادی کو منڈاناؤ میں آباد کرنا شروع کیا۔ یہی پالیسی جمہوریہ کے تیسرے صدر ROMAN MAGSAYSAY کے دور میں قائم رہی۔ مسلمان کسانوں کی سادہ لوحی سے عیسائی ہم وطنوں نے ناجائز فائدہ اٹھایا اور مسلمانوں کی زمینوں پر بجبر و قوت قبضہ کر لیا۔ عیسائی نوآبادکاروں کی پشت پناہی حکومت کر رہی تھی۔ حکومت نے تمام ایسی زمینوں کو سرکاری ملکیت قرار دیدیا جن کے متصرفین کے پاس کوئی قانونی حقِ ملکیت نہ تھا۔

ہسپانوی اور امریکی حکمرانوں نے مسلمان کسانوں کو ہی زمینوں کا مالک تسلیم کر لیا تھا۔ جو زمینوں کو زیرِ تصرف لائے ہوئے تھے اور نسل در نسل ورثے میں حاصل کر رہے تھے۔ عدل و انصاف

کا اصول بھی یہی ہے کہ جو لوگ سالہا سال سے زمین کاشت کر رہے ہیں اور محنت و مشقت سے بنجر زمینوں کو آباد کیا ہے وہی ان کے مالک ہیں. حکومت فلپائن کا یہ اقدام اس لئے بھی موزوں نہ تھا کہ جن لوگوں کے پاس زمین کی ملکیت کی دستاویزیں موجود بھی تھیں. صدہا سال ان کا محفوظ رہنا بھی ناممکن ہے.

سرکاری اعلان کے بعد تعلیم یافتہ اور ہوشیار عیسائی نو آباد کاروں نے درخواستیں گزار کر زمین کے حقوقِ ملکیت حاصل کر لئے مگر مسلمان سادہ لوح کسان دفتری پیچیدگیوں کی بنا پر اس مرحلے میں ناکام ہو گئے، اور یہی مسئلہ فلپائن میں مذہبی جنگ کی صورت اختیار کر گیا.

حکومت کے اس اقدام سے منڈاناؤ کے ہزاروں مسلمان گھرانوں کا سکون چھن گیا مگر حکومت نے متاثر مسلمان خاندانوں کی بہتری اور فلاح و بہبود کے متعلق قطعی طور پر نہیں سوچا. ظاہر ہے وسطی اور شمالی فلپائن کے امیر تاجر اور صنعت کار جن کی مستقل سکونت بھی ان ہی علاقوں میں ہے. انہیں غریب کسانوں سے زمین لے کر دینے سے ملک کی قسمت کہاں تک بدل سکتی ہے.

اس صورت حال نے مسلمانوں کو جد و جہد پر مجبور کر دیا ان کی جد و جہد کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کو معاشرتی زندگی میں ان کا جائز مقام دیا جائے. انہیں ہمیشہ نظر انداز کیا گیا ہے. کبھی کوئی گورنر یا وزیر مسلمانوں سے نہیں لیا گیا. حکومت کے اعلیٰ مناصب ان کے لئے شجرِ ممنوعہ کی حیثیت رکھتے ہیں.

۱۹۶۸ء میں جنوبی فلپائن کے مسلمان راہنما داتو متالم (DATO MATALAM) نے حکومت کو متنبہ کیا تھا کہ کہ اگر مسلمانوں کی معاشی، سیاسی، سماجی اور زندگی سنوارنے کے لئے حکومت نے کوئی توجہ نہ دی تو مسلمان علیحدہ ہونے اور اپنی حکومت خود بنانے پر مجبور ہو جائیں گے. مسلمان نمائندوں نے مطالبہ کیا ہے کہ تین جنوبی جزائر، منڈاناؤ، سولو، اور پالان کو جدا کر کے مسلمان حکومت قائم کر دی جائے ـــــ.

LONDON TIMES کے خصوصی نامہ نگار RAMSAY WILLIAM نے منیلا سے اخبار مذکور کو لکھا ہے:

"فلپائن کو اس پر فخر ہے کہ ایشیا میں واحد عیسائی قوم ہے. لیکن حقیقت یہ ہے کہ ۳۵ ملین آبادی میں پانچ ملین مسلمان ہیں. مسلمان آبادی اپنے وطن میں دوسرے درجے کی شہری ہے، اور موجودہ سماجی حیثیت پر ناراضگی کا صاف صاف اظہار کر رہے ہیں. کوئی مسلمان سینیٹر نہیں ہے. اور فلپائن کے ایوانِ نمائندگان میں

صرف چار مسلمان ہیں۔ فوج میں کوئی مسلمان جنرل نہیں ہے۔ اور نہ پولیس کے اعلیٰ عہدوں پر ہی کوئی مسلمان فائز ہے۔ زرعی اراضی جو نسل در نسل مسلمان خاندانوں میں چلی آرہی ہے۔ ان کے مالکوں سے مبہم قانونی طریقوں سے چھین کر شمالی عیسائی آبادی کے ہاتھ دی جارہی ہے۔"

قتل وغارت | متذکرۃ الصدر صورت حال کے پیش نظر منڈاناؤ میں مقامی آبادی اور عیسائی نو آباد کاروں میں جھڑپیں شروع ہوگئیں۔ ۲۲ر جون ۱۹۷۱ء کو سرکاری طور پر اعلان کیا گیا کہ :

"۱۹ر جون کو ایک سو کے لگ بھگ مسلمان ایک گاؤں کی مسجد میں نماز ادا کر رہے تھے۔ ان پر مسلح حملہ کیا گیا اور فائرنگ سے اکسٹھ ہلاک ہوگئے۔"

صوبے میں مقیم ایک فوجی افسر نے قتل وغارت کی توثیق کی ہے کہ ان میں چھپن جگہ پر ہی ہلاک ہوگئے، جن میں ۲۹ عورتیں اور ۱۳ بچّے شامل ہیں بعد ازاں زخمیوں میں سے پانچ چل بسے۔ اس نے کہا کہ ۲۳ باوردی افراد جو ہتھیاروں سے مسلح تھے۔ اس قتل وغارت کے مرتکب ہوئے۔

ایک دوسری اخباری اطلاع کے مطابق کوٹا باٹو میں دو سو کے لگ بھگ مسلمان ہلاک ہوچکے ہیں۔ اور گیارہ مختلف مقامات پر پانچ سو گھروں کو جلا دیا گیا ہے۔ مسلمان زمینوں کی واپسی اور سماجی زندگی میں اپنا مقام منوانے کی جدوجہد کر رہے ہیں۔ جس کے لئے انہیں جانی اور مالی قربانی دینی پڑ رہی ہے۔ ۱۱ر اگست کو ایک جھڑپ میں تیس مسلمان جانیں دے بیٹھے اور یہ سلسلہ تاحال جاری ہے۔

مسلمانوں کے مسئلے کا حل | فلپائن کی موجودہ سیاسی اور سماجی زندگی پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالنے سے یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ مسلمانوں کو اپنی کسمپرسی اور ان کے ساتھ کی گئی زیادتی کا شدّت سے احساس ہے۔ اور وہ برابر کے حقوق کے طلب گار ہیں۔ ان کے مطالبات کے پیشِ نظر مندرجہ ذیل اصلاحات ناگزیر ہیں۔

۱- وفاقی طرزِ حکومت :- فلپائن جو وحدانی ریاست ہے۔ اسے وفاقی ریاست میں بدلنا ضروری ہے۔ مسلمان اکثریت کے تینوں جزائر۔ منڈاناؤ، سولو، اور پالاوان کو ملا کر ایک وفاقی یونٹ بنا دیا جائے۔ وفاقی یونٹ مقامی مسائل کو حل کرنے میں آزاد ہو۔

۲- جداگانہ انتخاب :- مرکزی حکومت کی اسمبلی کے لئے جداگانہ طریقِ انتخاب اختیار کیا جائے تاکہ مسلمان آبادی کے نمائندے مسلمان ہی ہوں۔ نیز مرکزی حکومت میں مسلمانوں کو مناسب نمائندگی دی جائے۔

۳- سرکاری ملازمتیں :- موجودہ حکومت کے اہم عہدوں پر کوئی مسلمان فائز نہیں ہے۔ فوج اور پولیس میں بھی ان کے پاس کوئی عہدہ نہیں ہے۔ سرکاری ملازمتوں میں آبادی کے تناسب سے مسلمانوں کو لیا جائے۔

عالم اسلام کی ذمہ داریاں | حال ہی میں اسلامی سیکرٹریٹ کے سیکرٹری جنرل تنکو عبدالرحمٰن نے حکومت فلپائن سے رپورٹ طلب کی ہے کہ فلپائنی مسلمانوں کے مسائل کے حل کے لئے حکومت کیا کر رہی ہے۔ تنکو عبدالرحمٰن نے کہا ہے کہ کابل کانفرنس میں فلپائنی مسلمانوں کے مسئلے کو پیش کیا جائے گا۔ اور ان کی فلاح و بہبود کے لئے مناسب قدم اٹھایا جائے گا۔ تاہم مسلمانانِ عالم پر فرض عائد ہوتا ہے کہ اپنے ہم مذہبوں کی مدد کریں۔ "مسلمان جسدِ واحد کی مانند ہیں جسطرح جسم کے ایک عضو کو تکلیف ہو تو پورا جسم اس سے متاثر ہوتا ہے۔ دنیائے اسلام کے کسی جزو کو تکلیف پہنچے تو تمام عالم اسلام کا اس سے متاثر ہونا ضروری ہے۔"

پانچ ملین فلپائنی مسلمانوں کو بچانے کیلئے عالم اسلام کی تنظیمیں مندرجہ ذیل طریقوں سے انکی مدد کر سکتی ہیں :

۱۔ منڈاناؤ کی یونیورسٹی کو اسلامی لٹریچر مہیا کیا جائے جس میں جدید تہذیب اور لادینی نظریات کا تعاقب کیا گیا ہو اور اسلام کو ایک متحرک نظامِ زندگی کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہو تاکہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ اسلام پر مضبوطی سے قائم ہو۔

۲- فلپائن میں مسلمان اساتذہ، مبلّغ اور مشنری روانہ کئے جائیں جو مسلمانوں میں اسلامی روح بیدار کریں اور اسلامی تعلیمات کو عام کریں۔

۳- منیلا میں اسلامی مرکز قائم کیا جائے اور ان تمام علاقوں میں اس کی شاخیں قائم ہوں جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں تاکہ ان کی روزمرّہ زندگی میں مناسب راہنمائی کی جا سکے۔

۴- ایسے وقف قائم کئے جائیں جن کی طرف سے فلپائنی مسلمان طالب علموں کو وظائف دیئے جائیں تاکہ وہ جدید تعلیم کے زیور سے آراستہ ہو سکیں۔

ماخذ

1. THE PREACHING OF ISLAM - (T. W. ARNOLD)
2. MOSQUE AND MORO : A STUDY OF MUSLIMS IN THE PHILIPPINES (BOWING PETER)
3. THE CRITERION (KARACHI) MARCH, 1971
4. THE MUSLIM WORLD (WEEKLY) KARACHI.
5. THE MUSLIM NEWS INTERNATIONAL, KARACHI.
6. THE PAKISTAN TIMES, LAHORE (DAILY)

■■

سفرِ افغانستان کے پراگندہ نقوش

ایڈیٹر کے قلم سے

محمود غزنوی رح کے دیس میں

بلخ کے کھنڈرات یا علم و حکمت کے دفینے

اس خطہ صالحین سے ذرا آگے بڑھیں تو سڑک چھوڑ کر قاضی ابو مطیع بلخی کے مزار پر حاضری دیں یہ اپنے وقت کے ممتاز عالم قانون اسلامی اور شریعت کے امام تھے۔ نام عبدالحکیم بن عبداللہ کنیت قاضی ابو مطیع۔ منظوم کتبہ سے معلوم ہوتا ہے کہ امام اعظم ابوحنیفہ کے تلمیذ اور قاضی ابو یوسف و امام محمد کے رفیق طریق تھے۔ تاریخ وفات اشعار میں "جہان علم" ۱۹۹ قمری ہجری لکھی ہے۔ اب ہمارا بردبار اور معمر ترکستانی قائد جسے مزار شریف کے متولی و خطیب اور وہاں کے دیگر علماء نے ہمارے ہمراہ کیا ہے، ہمیں فقیہ امت ابو اللیث سمرقندی کے مزار پر لے گیا۔ فقیہ ابو جعفر ہندوانی کا یہ قابل فخر شاگرد نصر بن محمد بن احمد السمرقندی فقہ حنفی کا اہم ستون ہے۔ اپنے وقت میں امام الھدیٰ کے لقب سے علمی دنیا سے خراج تحسین حاصل کیا۔ فقہ حنفی اور دیگر علوم میں بیشمار کتابیں تصنیف کیں کتب تذکرہ میں انکی کئی کتابوں۔ تنبیہ الغافلین، البستان، شرح الجامع الصغیر، النوازل والعیون والفتاوی، خزانۃ الفقہ، مستن متن فی الفقہ، تفسیر القرآن، فتاوی ابواللیث۔ وغیرہ کا ذکر ملتا ہے۔ علمی اور فقہی حلقوں میں آج بھی ان کے فتاویٰ اور اقوال کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ شہر بلخ سے باہر ۳۷۶ھ مطابق ۹۸۵ء یا ۳۷۳ھ یا ۳۷۵ھ یا ۳۹۳ھ میں وفات پائی۔ ان کی علمی عظمتوں کے سامنے گردن سرنگوں ہو جاتی ہے کہ آج بھی رہا سہا جو کچھ مسلمانوں کے پاس ہے ایسے ہی بزرگوں کی محنتوں کا ثمرہ ہے۔ — مزار کے شکستہ تختہ پر بائیں جانب ایک اور قبر ہے جو کسی عالم اور حبر امت ہی کی ہوگی۔ مگر نام و نشان نامعلوم فقیہ ابو اللیث کے سرہانے کتبہ بھی گردش ایام کی وجہ سے ٹوٹ پھوٹ گیا ہے۔ اس پر دو ایک سطریں باقی ہیں جو بمشکل سے پڑھی جاتی ہیں۔ اپنی عظمت رفتہ کے آثار کی حفاظت غیور قوموں کا شیوہ ہے مگر خدا معلوم افغانستان کی حکومت کبھی ان آثار کی حفاظت کی طرف توجہ دے بھی سکے گی یا نہیں۔ کلچر اور ثقافت کے جشنوں پر لاکھوں روپے اڑانے والی قومیں اپنی اصل تہذیب و تمدن کی بنیادوں کی طرف کم ہی متوجہ ہوا کرتی ہیں۔ اور اپنے ماضی سے

بے خبر ملکوں کے عجائب خانوں کی رونق فراعنہ کے آثار گوتم بدھ کے نقوش اور کنشک کے گھسے پھٹے باقیات ہی سے ہوتی ہے ـــــ الغرض دونوں قبریں کھلے میدان میں اور بلخ کے اکثر مزارات کیطرح گوشۂ گمنامی میں بدعات و رسوم سے دور مزار غریباں بنی ہوئی ہیں۔ اللہ کی شان جن لوگوں کی زندگی اتباعِ سنت کی تلقین ظواہر شریعت کی حفاظت اور بدعات و منکرات سے جہاد میں گذری عموماً ان کی قبروں کو بھی اللہ نے ان خرابیوں سے محفوظ رکھا۔ یہ ایک ایسا صلہ ہے کہ خالص اپنے رب کے ہونے والے بندوں کو دنیا میں بھی مل رہا ہے ـــــ ایک اور سمت میں جائیے تو خواجہ عکاشہؒ کا مزار ہے کہنے والوں نے کہا کہ ابراہیم ادھم کے والد بزرگوار ہیں، خواجہ آب کشاں کے نام سے معروف ہیں، خواجہ آب کشاں ابراہیم ادہم کے والد ہوں یا نہ ہوں مگر اس سلطانِ دنیا و دین کو جسے اقلیم معرفت ابراہیم ادہم کے نام سے جانتی ہے، اسی علاقہ سے نسبت رہی، وہ یہاں کے فرمانروا تھے۔

جب رات کو اپنی خوابگاہ کے اوپر کسی کی آہٹ سنی تو پوچھنے پر کسی نے کہا کہ چھت پر اپنا گم شدہ اونٹ دیکھ رہا ہوں۔ سلطان بلخ کو تعجب ہوا۔ پوچھا کہ شاہی خوابگاہ کی چھت اور اونٹ؟ جواب میں ایک ملکوتی آواز آئی کہ ارے غافل! تو جب کمخواب اور اطلس کے زریں بستروں میں خدا کو ڈھونڈھ رہا ہے تو چھت پر اونٹ کی تلاش تو اس سے کم تعجب خیز ہے ـــ تیر نشان پر لگ گیا۔ ابراہیم گھائل ہو گئے اور مرغِ بسمل کی طرح تڑپتے ہوئے تخت و تاج کو غیر فانی سلطنت، اقلیم عشق سے ٹکرا دیا۔ اب دل کے آئینہ میں اپنی برزخی منزل نگاہوں کے سامنے تھی جس میں نہ کوئی مونس تھا نہ غمخوار، نہ لشکر و سپاہ کا ہنگامہ تھا نہ دولت و سلطنت کی جاہ و جلال ـــــ سفر دور دراز درپیش مگر زادِ راہ معدوم، ایک عادل اور قادر قاضی کی عدالت مگر نہ گواہ نہ وکیل۔ پھر دنیا کی اس چند روزہ حکومت اور شوکت کی کیا وقعت رہ سکتی تھی۔ مملکت خراسان کو خیر باد کہا، وسعت دل کی پنہائیوں میں گم ہو گئے، ملک نیم شب کی حلاوتوں کے سامنے ملک نیمروز کی سرابی لذتوں کی کیا نسبت، اور آج ابراہیم ادہم ایک سلطان و امیر نہیں بلکہ عارفانِ طریقت کی نگاہوں میں سلطانِ دین، سیمرغ قاف الیقین، گنج عالم عزلت، صدیق روزگار ہیں (عطارؒ) سونے چاندی کے خزانوں کو لات ماری، شیخ عراق جنید بغدادیؒ کی زبان میں مفتاح العلوم بن گئے اور علم حقیقی کے مخفی خزانوں کی کنجیاں ہاتھ آ گئیں۔ اب قوت و جبروت سے لوگوں کے جسموں کو زیر نہیں کر رہے تھے۔ مگر دلوں کی دنیا حکمرانی میں مل گئی۔

یہ عجیب اتفاق تھا کہ گذرنے والی رات کو مزار شریف میں ایک مجلس کے صدقے چشم تصور نے ابراہیم ادہم کا دور گویا محسوس ہوتے دیکھا۔ یہ مجلس عشاء کے بعد روضۂ مبارک (منسوب بہ حضرۃ علیؓ)

کے قدموں میں متولی کے حجرۂ خاص میں چند سراپا اخلاق و شرافت بزرگوں نے رات کے کھانے پر اپنے نووارد مہمانوں کیلئے منعقد کی تھی جس میں ایک بزرگ نے سراپا سوز آواز میں مولانا روم کی مثنوی کا وہی حصہ خاص لے میں سنایا جس کا تعلق ابراہیم ادہم کی صحرانوردی سے تھا۔ اور سرزمین پر قصۂ زمین نے ایک خاص اثر پیدا کر دیا۔ چند لحظوں کیلئے ارد گرد سے بے خبر مسحور ہو کر عالم خیال میں اپنے آپ کو اُس عہد شکوہ میں پایا کہ ابراہیم ادہمؒ گدڑی پہنے سوزِ الٰہی میں بادیہ پیمائی کر رہے ہیں۔ محبوب حقیقی کا یہ متلاشی بلخ کے قریب دریائے جیحون کے کسی کنارے بیٹھا ہو گا۔ کہ جدائی میں تڑپتی ماں یا بعض روایات کے مطابق دوست احباب تلاش کرتے وہاں پہنچے ماں نے ابراہیم کو اپنے فیصلہ پر سرزنش کی۔ نازو نعمت اور امارت و شوکت کے مقابلہ میں اس فقر و غربت اور بے کسی پر افسوس کا اظہار کیا۔ ابراہیمؒ نے جو گدڑی کو پیوند لگا رہے تھے، اپنی سوئی دریا میں ڈال دی اور پھر ایک ہاں کے سامنے دریا کی مچھلیوں کو حکم دیا کہ مجھے سوئی چاہئے، ہزاروں مچھلیاں منہ میں سونے کی سوئی لئے پانی میں ابھر آئیں۔ ابراہیمؒ نے سونے پر نگاہ حقارت ڈالتے ہوئے کہا مجھے اس کی کیا ضرورت اس متاع کی تو میرے ہاں فراوانی تھی، مگر میں نے اسے سکون و اطمینان اور وصال حقیقی کی لازوال دولت کے بدلے ــــ ٹھکرا دیا ہے۔ اب مچھلیوں نے دوبارہ غوطہ لگایا اور ایک مچھلی منہ میں وہی سوئی لئے ہوئے ابراہیمؒ کے قدموں میں ڈال آئی۔ اور اسطرح ابراہیمؒ نے اپنی والدہ کو سمجھانا چاہا کہ اماں جان یہ سلطنت اچھی ہے یا توپ و تفنگ۔ اور سیم و زر کے زور سے جو چند آدمیوں کے صرف جسموں پر قائم ہوتی ہے۔ یہ تو قلوب کی حکمرانی ہے ــ اور انسانوں پر ہی نہیں بلکہ حیوانات تک پر حاوی ہوتی ہے۔ ایسے لوگوں کیلئے تو دریاؤں کی مچھلیاں، صحراؤں کے وحوش اور فضاؤں کے پرندے بھی دعاگو رہتے ہیں کہ ان کی دم خم سے تو اللہ کے نام کا پرچا اور ان کی رونق سے کائنات آباد رہتی ہے۔

ملک دل بہ یا چنیں ملک حقیر	رو بدو کرد و بگفتش کاے امیر
باطنی بجوئی بظاہر برمایست	ایں نشان ظاہرست ایں ہیچ نیست

یہ ابراہیم ادہم کا قصہ تھا بارہا جس کے سننے کا اتفاق ہوا مگر رات کی مجلس میں سنانے والا مثنوی مولانا روم کا ایک دلدادہ تھا، پڑھنے کا عجب انداز، ڈوب کر سنا رہا تھا۔ عجیب سوز و گداز۔ اور لکھنے والا مولائے روم ــــــ!

اس کے بعد آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں

حضرت علامہ مولانا شمس الحق افغانی مد ظلہ
شیخ التفسیر جامعہ اسلامیہ بہاولپور

قسط ۲

قرآنِ حکیم کی عظمت

اصلاحی، قانونی اور سیاسی نقطۂ نظر سے

قرآن کی اصلاحی عظمت | انسانی اصلاح کا اصلی مرکز دل ہے۔ جب وہ درست ہو جائے تو باقی اعضا خود بخود ٹھیک ہو جاتے ہیں۔ جیسے بخاری میں نعمان بن بشیر کی حدیث مرفوع میں صلح الجسد کلہ آیا۔ دل روح انسانی کا اصلی مستقر ہے۔ تو گویا روح کی اصلاح پر پوری شخصیت کی اصلاح مبنی ہے۔ روح عالم امر سے ہے۔ جیسے قرآن میں آیا ہے۔ قل الروح من امر ربی۔ تو اس امر ربی کی اصلاح بھی امر ربی یعنی کلام الٰہی سے ہوگی۔ اور کلام الٰہی فی الحقیقت غذاء روحانی ہے۔ بدن زمین سے ہے۔ اس کی غذا بھی زمین سے ہے۔ اور روح امر سماوی ہے۔ اس کی غذا بھی سماوی ہے یعنی کلام الٰہی سے ہوگی۔ اگر جسم و بدن کی نشوونما اور قوۃ وارتقار زمین سے حاصل کردہ غذا کے بغیر ممکن نہیں۔ تو روح کی ترقی و قوت اور نشوونما آسمانی غذا یعنی کلام الٰہی کے بغیر ممکن نہیں۔ اب یہ فیصلہ کہ قرآن واقعی ایک عظیم روحانی غذا اور کلام الٰہی ہے یا نہیں۔؟ تو اس کا فیصلہ تمام غذاؤں کے اصول کے قانون کے مطابق کیا جائے گا۔ اگر غذا کے استعمال سے درستی ہوئی۔ ضعف و کمزوری رونما نہ ہوئی، بلکہ سابق کمزوری بھی دور ہوئی۔ اور ایسی غذا صحیح اور مقوی غذا ہے۔ اور اگر کمزوری دور نہ ہوئی۔ بلکہ زیادہ ہوئی تو غذا نہیں۔ اب قرآن کے نسخہ کو صحابہ کرام نے استعمال کیا۔ ان کی زندگی قبل از اسلام و قبل القرآن تمام برائیوں سے لبریز تھی۔ خدا پرستی کی جگہ بت پرستی، اتحاد کی جگہ خانہ جنگی تھی۔ عدل کا نام نہ تھا۔ بلکہ ظلم پر فخر کیا جاتا تھا۔ زنا، شراب، سود خواری، ابتلا عالم تھا۔ اصلاح کے اسباب میں سے کوئی سامان موجود نہ تھا۔ نہ تعلیم تھی نہ تربیت، نہ عدالت نہ قانون، نہ تعزیرات و سزا اور لوٹ کھسوٹ زندگی کا عالم معمول تھا۔ قرآن آیا۔ اور ایسے لوگوں کی اصلاح کے لئے آیا۔ پھر قرآن کی اصلاح کے لئے وقت بھی بہت تنگ ملا۔ نبوت کے تیئس سالہ زمانہ میں تیرہ ۱۳ سال مکی زندگی میں ——— تو قرآن کی آواز کفار کے جبر و استبداد کی وجہ سے بند تھی۔ کہ قرآن کی دعوت موت کو دعوت دینے کے

برابر تھی۔ ہجرت کے بعد کی گیارہ سالہ زندگی میں اکثر حصہ کفارِ عرب کی جنگوں اور حملوں کی مدافعت میں گذرا۔ بمشکل تین چار سال صلح حدیبیہ اور فتح مکہ کے بعد کے ایسے ملے کہ قرآن کو عرب پر اصلاحی اثر ڈالنے کا موقعہ ملا۔ لیکن اس مختصر عرصہ میں قرآن نے عرب پر وہ اثر ڈالا، اور ایسی جماعت تیار ہوئی جن کا ظاہر و باطن، اخلاق، عقائد، اعمال، معاملات، معاشرہ، سیاست اور بین الاقوامی تعلقات ایسے بن گئے۔ جن کی نظیر تاریخ بشری میں نہ پہلے گذری ہے نہ آئندہ ممکن ہے۔

کیا آپ دنیا کی کوئی ایسی کتاب بتلا سکتے ہیں جس سے تھوڑے عرصہ میں ایسی ہستیاں پیدا ہوئی ہوں جن کا ایک ایک وصف بے مثال ہو۔ مثلاً صدیق کی صداقت، فاروق اعظم کا عدل و سیاست، خالد بن ولید کی فوجی قیادت، عمرو بن عاص کا تدبر، پھر ان سب امور میں خدا سے تعلق، شاہی میں درویشی کا رنگ، یہ سب کچھ قرآن کی تعلیم اور حضور علیہ السلام کی صحبت کا نتیجہ تھا۔ یہ عظیم اور بے مثال اصلاحی کارنامہ جو عرب میں اور بعد ازاں چار دانگ عالم میں پھیل گیا۔ یہ قرآن کی عظمت کے لئے حجتِ قاطعہ نہیں۔؟

۵۔ **قرآن کی قانونی عظمت** قانون ہر مخلوق کی زندگی کا ضابطہ ہے۔ خواہ جمادات ہوں، نباتات یا حیوانات یا انسان۔ فرق صرف یہ ہے، کہ انسان کے ماسوا امور ایک جبری قانون میں جکڑے ہوئے ہیں جس کو ہم قانونِ قدرت کہتے ہیں۔ آسمان کے ستارے و سیارے ایک خاص نظامِ حرکت سے مربوط ہیں، اس نظام کی خلاف ورزی نہیں کر سکتے۔ پانی بلندی سے پستی کی طرف جا سکتا ہے۔ اس کے خلاف نہیں کر سکتا۔ زمین سمندر کے نیچے رہے گی پانی کے اوپر نہیں تیر سکتی۔ ایک رتی بھر سوئی کو سمندر میں ڈال دو تو ڈوب جائے گی۔ لیکن سینکڑوں ٹن کا جہاز سمندر پہ تیرتا رہے گا۔ درختوں کی جڑیں نیچے جائیں گی۔ اور شاخیں اوپر۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ شاخیں نیچے جائیں اور جڑیں اوپر۔ مویشی گھاس کھائیں گے اور گوشت نہیں کھائیں گے۔ لیکن درندے گوشت کھائیں گے اور گھاس نہیں کھائیں گے۔ یہ ان مخلوقات کی قانونی زندگی کی دلیل ہے۔ جو قانونِ قدرت کے تحت ان پر حاوی ہے اور ان کے خلاف ان کو مجالِ دم زدن نہیں۔ کیونکہ یہ جبری قانون ہے ؎

آسماں مجبور ہیں شمس و قمر مجبور ہیں 		انجم سیماب پا رفتار پہ مجبور ہیں

یہی جبری قانون انسان پر بھی حاوی ہے۔ کہ وہ قدموں کے بل چل سکتا ہے۔ سر کے بل نہیں چل سکتا لیکن انسان کے لئے اختیاری قانون بھی ہے۔ جس کا کرنا نہ کرنا اس کے اختیار میں ہے۔

اس لئے انسان فاعل مختار ہے۔ اسی اختیار پر حسن قبح نقص وکمال ثواب وعقاب کا مدار ہے۔ اس قانون شریعت ہے۔ اگر بنانے والا خدا ہو۔ اور قانون انسان ہے۔ اگر بنانے والا انسان ہو خواہ ایک فرد ہو بادشاہ یا ڈکٹیٹر یا جماعت ہو یا پارلیمنٹ۔ لیکن نفس قانون اختیاری کی ضرورت تمام اقوام میں مسلم ہے۔ اس لئے کوئی ملک اور کوئی حکومت قانون سے خالی نہیں۔ اب ہم کو یہ طے کرنا ہے کہ قانون اختیاری انسان کا حق ہے یا خدا کا۔ اس لئے ضروری ہے کہ ہم ضرورت قانون کی اصلی وجہ یا وجوہات بیان کریں۔

۱۔ انسان میں جب تک خواہش موجود ہے۔ وہ دوسروں کا حق مارنے سے دریغ نہیں کریگا۔ اور جب تک اس میں غضب کا جذبہ موجود ہے، وہ دوسروں پر دست درازی سے باز نہیں آئے گا۔ پہلی صورت میں مال کو خطرہ ہوگا۔ اور دوسری صورت میں جان کو۔ جس کے تحفظ کے لئے دیوانی و فوجداری قوانین کا وجود ضروری ہے۔ تاکہ مال اور جان محفوظ رہ سکے۔ کیونکہ یہ تو ممکن نہیں یہ دونوں خطرے جذبے جو لوازمات انسانیت سے ہیں موجود ہوں اور ان کے نتائج موجود نہ ہوں۔ اب اقامت عدل اور تحفظ حقوق انسانیہ کیلئے قانون سازی کیا انسان کا حق ہے یا خدا کا۔ یہ فیصلہ آسانی سے سمجھ میں آسکے گا۔ جبکہ مندرجہ ذیل امور ذہن نشین ہوں۔ قانون ساز قوت میں مندرجہ ذیل امور کا پایا جانا ضروری ہے۔

۱۔ علم تام ۲۔ عدل کامل ۳۔ رحمت و شفقت کاملہ ۴۔ غیر جانبداری

یہ چار امور صرف اللہ کی ذات میں موجود ہیں۔ انسان خواہ فرد ہو یا جماعت ان سے خالی ہے۔ لہذا انسان کو قانون اور ضابطۂ حیات کی تشکیل کا حق نہیں۔ پہلی چیز یعنی علم تام وہ انسان کو حاصل نہیں۔ اسمبلیوں اور پارلیمنٹوں میں انسانی قانون کی وقتاً فوقتاً تبدیلی اس امر کی دلیل ہے۔ کہ انسان کے علم اور اس کے قانون میں نقص موجود ہے۔ پھر ایک ملک کا قانون دوسرے ملک سے اور ایک پارلیمنٹ کا قانون دوسری پارلیمنٹ سے مختلف ہے۔ جو انسانی علم کے تردد و تشکک کی دلیل ہے۔ لیکن خالق کائنات کا علم مکمل ہے۔ پھر خدا انسانی زندگی کے ہر دور کے خیر و شر کو جانتا ہے۔ خواہ دنیوی زندگی سے متعلق ہو یا برزخ و قبر سے یا آخرت سے۔ لیکن انسان کو اگر کسی حد تک علم ہے تو صرف دنیا کا علم اور وہ بھی حال کا علم نہ مستقبل امور کا۔ باقی برزخ و آخرت کے امور وہ تو انسان کے عقل و حواس سے غائب ہیں۔ لہذا انسانی پارلیمنٹ اگر نفع سمجھ کر سود و قمار کے کے جواز کا قانون پاس کردے تو اس کی نظر سے سود و قمار کے مستقبل کے مہلک اثرات و نتائج

غائب ہوتے ہیں۔ اور قبر و آخرت کی جو مضرت ان دونوں چیزوں میں ہوگی وہ بھی اس کے دائرۂ عقل سے خارج ہے۔ لیکن خالق کائنات جو اصل سرچشمہ قانون ہے۔ صرف اس کا علم تمام ان سب پر حاوی ہے۔ اور انسان کے حقیقی نفع و نقصان کو وہی جانتا ہے۔ اور سود و قمار کے مستقبل اور برزخ و آخرت کے تباہ کن اثرات بھی جانتا ہے۔ لہذا اس کا قانون صحیح علم پر مبنی ہے کہ یہ دونوں امور ناجائز ہیں۔

پھر بڑی بات یہ ہے کہ انسانی عقل و فہم میں زیادہ خواہش و عادت کی دخل اندازی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسانی پارلیمنٹوں کے اعلیٰ تعلیم یافتہ ممبران کی اکثریت ان قوانین کو بناتی ہے۔ جن کی برائی میں کوئی شبہ نہیں۔ جیسے انگلستان اور کینیڈا کی پارلیمنٹ نے جواز لواطت کا قانون پاس کیا۔ اس کے علاوہ انسان ذاتی مفاد اور قومی مفاد کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ لہذا وہ عمومی مفاد و دیگر اقوام کے ساتھ انصاف کا عملاً حامی نہیں ہو سکتا۔ جس کی بڑی دلیل دنیا کے سب سے بڑے عالمی ادارۂ امن و انصاف کا طرز عمل ہے۔ جس میں چھوٹی بڑی سو کے قریب اقوام شامل ہیں۔ لیکن درحقیقت یہ ادارہ دنیا کی پانچ بڑی طاقتوں کے ہاتھ میں کھلونا بن کر رہ گیا ہے۔ اور آج تک وہ کسی مظلوم قوم کو اس کا حق نہ دلا سکا۔ بلکہ اعلان حق تک نہ کر سکا۔ اس تجربہ کے بعد موجودہ دور کے انسان سے قانون انصاف کی توقع سعی لاحاصل ہے۔ اس بڑے عالمی ادارے کا یہ قانون ہے کہ پانچ بڑی طاقتوں کو ویٹو پاور یعنی حق تنسیخ حاصل ہے۔ یعنی ان پانچ طاقتوں میں سے کوئی ایک بھی اگر ایک مظلوم ملک یا قوم کا مسئلہ زیر بحث نہ لانا چاہئے۔ تو اس پر اس ادارہ میں بحث نہیں ہو سکتی۔ حالانکہ ظالم اکثر بڑی طاقتیں ہوتی ہیں۔ جب ان کے خلاف کوئی مقدمہ پیش ہی نہیں ہو سکتا۔ تو مظلوم کی حق رسی کیونکر ممکن ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ اس ادارے کی صحیح حقیقت وہی ہے، جو مستقل مندوب پاکستان سید احمد شاہ بخاری مرحوم نے اپنے طویل تجربے کے بعد اخبار جنگ ۲ر دسمبر ۱۹۶۷ء میں شائع کی۔ یہ تقریر انہوں نے ۷ر جنوری ۱۹۵۳ء میں کی تھی۔ تقریر یہ ہے کہ اگر اقوام متحدہ میں دو چھوٹی قوموں کا تنازعہ در پیش ہو تو وہ تنازع اور مقدمہ غائب ہو جائے گا۔ اور اگر یہ تنازعہ ایک چھوٹی اور ایک بڑی قوم کا ہو، تو چھوٹی قوم غائب ہو جائے گی۔ اور اگر یہ تنازعہ دو بڑی قوموں میں ہو تو خود اقوام متحدہ غائب ہو جائے گی۔ یہ ہے دور حاضر کی انتہائی تعلیم کے بلند ترین انسانوں کے انصاف اور قانون کا مظاہرہ۔ ع۔ قیاس کن ز گلستان ما خزان مرا۔

اس لئے انصاف اور قانون کا سرچشمہ صرف اللہ ہے، جس کا قانون قرآن کی شکل میں

محفوظ ہے۔ جس سے قرآن کی عظمت نمایاں ہو جاتی ہے۔ ان الحکم الا للہ۔ قانونِ دنیا صرف خدا کا حق و تمت کلمت ربک صدقا و عدلا۔ اللہ کا کلام سچائی اور انصاف کے لحاظ سے تام اور کامل ہے۔ بقول علامہ اقبالؒ ؎

سروری زیبا فقط اس ذات بے ہمتا کو ہے — حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آزری

غیر حق چوں ناہی و آمر شود
زور ور بر ناتواں قاہر شود

قرآن کی عظمت کے متعلق یورپ کے محققین کی شہادت ۔ ۱۔ سر ولیم لکھتا ہے:

وسیع جمہوریت رشد و ہدایت فوجی تنظیم مالیات غربار کی حمایت اور ترقی کے اعلیٰ آئین قرآن میں موجود ہے۔

۲۔ ڈاکٹر موبیس فرانسیسی لکھتا ہے:

قدرت کی عنایتوں نے جو کتابیں انسان کو دی ہیں، قرآن ان سب سے افضل ہے۔

۳۔ ڈاکٹر سموئیل لکھتا ہے:

قرآن کے مطالب ایسے ہمہ گیر اور ہر زمانے کیلئے موزوں ہیں کہ تمام صدائیں خواہ مخواہ اس کو قبول کرتی ہیں۔ اور محلوں، ریگستانوں، شہروں اور سلطنتوں میں گونجتا ہے۔ (تاریخ اسلام عبدالقیوم ندوی ج ۱ ص ۳۲۷ تا ص ۳۳۲)

۴۔ جارج سیل لکھتا ہے:

کسی انسان کا قلم ایسی معجزانہ کتاب نہیں لکھ سکتا۔ اور یہ مردوں کو زندہ کرنے سے بڑا معجزہ ہے۔

۵۔ ایڈیسوئیل لکھتا ہے:

اگر وحی کوئی چیز ہے تو بیشک قرآن ایک الہامی کتاب ہے۔ (تاریخ اسلام عبدالقیوم ندوی ۳۲۷/۱ج)

۶۔ قرآن کی عظمتِ سیاسیہ ۔ قرآن نے اپنے ماننے والوں اور مؤمنین عاملین کو جو سیاسی قوت عطا کی ہے اسکی نظیر تاریخ بشری میں موجود نہیں۔ یہ سیاسی قوت بخشی قرآن کا سیاسی معجزہ ہے۔ قرآن کا براہ راست نزول عرب قوم میں ہوا۔ جو اکثر اقوام عالم سے تعداد میں کم جسم میں کمزور دولت و ثروت سے محروم اور علم و ہنر سے خالی تھے۔ نزولِ قرآن کے وقت عرب صرف موجودہ سعودی عرب اور یمن کا نام تھا۔ مصر، عراق، شام، فلسطین، اردن، لبنان، طرابلس، ٹیونس، الجزائر یہ غیر عرب ممالک تھے۔

جو اسلامی فتوحات کے بعد عرب ممالک بن گئے۔ دنیا عالم اسباب ہے، اور سیاسی غلبہ اور قوت کے لئے آٹھ اسباب مادی کا ہونا ضروری ہے۔ جب ایک قوم دوسری قوم سے ان اسباب کے لحاظ سے فائق ہو تو پہلی قوم دوسری قوم پر سیاسی غلبہ حاصل کر لیتی ہے۔ وہ آٹھ اسباب حسب ذیل ہیں :-

۱- عددی کثرت : اکثر حالات میں کثیر التعداد قوم قلیل التعداد پر فتح پاتی ہے۔ لیکن عرب قوم کی تعداد دیگر اقوام کی نسبت بہت کم تھی۔ یہاں تک کہ نزول قرآن کے زمانے میں ان کی تعداد دو چار لاکھ افراد بالیقین سے متجاوز نہ تھی۔

۲- دوسری چیز صنعت ہے، تاکہ اس کے ذریعہ آلات جنگ اور پوشاک مہیا کر سکے۔ لیکن عرب میں نہ کارخانہ تھا۔ نہ صنعت تھی۔ یہاں تک کہ عمدہ تلوار ہندوستان سے حاصل کی جاتی تھی جسکو سیف مہند کہتے تھے۔ اور پوشاک شام کے عیسائیوں سے۔

۳- تیسری چیز تعلیم ہے۔ سیاسی اقتدار اور نظم و نسق مملکت چلانے کیلئے تعلیم ضروری ہے۔ لیکن عرب امیین یعنی ناخواندوں کا ملک تھا۔ نہ کوئی مکتب نہ مدرسہ نہ کتاب۔

۴- چوتھی چیز اتفاق ہے، تاکہ افراد کی منتشر قوت منظم ہو کر ایک ہی مقصد کی طرف متوجہ ہو سکے۔ لیکن عرب کا ہر قبیلہ دوسرے کا دشمن تھا۔ انصار مدینہ کے دو قبیلے اوس و خزرج آپس میں دشمن تھے۔ اور سالوں ایک دوسرے سے لڑتے رہے۔

۵- پانچویں چیز زراعت ہے، تاکہ ضروریات زندگی میں ملک خود کفیل ہو سکے۔ اور غذائی ضروریات مہیا ہوں۔ لیکن غذا میں عرب غیر اقوام کے محتاج تھے۔ خرما کے سوا ان کے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ اور وہ بھی صرف بعض علاقوں میں۔ اس لئے قرآن نے حجاز کے متعلق فرمایا ہے۔ بواد غیر ذی زرع۔ یعنی وہ زمین جو بن کھیتی والی ہے۔

۶- چھٹی چیز معدنی دولت ہے۔ نزول قرآن کے وقت کے عرب میں کسی معدنی دولت کا وجود نہیں تھا۔ اب جو کچھ عرب میں نظر میں آرہا ہے، وہ دور حاضر کی پیداوار ہے۔

۷- ساتویں چیز جسمانی قوت ہے۔ عرب گرم ملک تھا ضروری غذا بھی میسر نہ تھی۔ پانی کی بھی کمی تھی۔ سردی اور گرمی سے بچنے کیلئے نہ ضروری مکانات تھے اور نہ مناسب لباس۔ اکثر آبادی خانہ بدوشوں کی تھی جو چولداروں میں رہا کرتی تھی۔ بیمار ہوتے تو نہ کوئی علاج تھا، نہ مناسب غذا۔ ان حالات میں ان کے اجسام عام اقوام سے نہایت نحیف کمزور اور ضعیف تھے۔

۸۔ آٹھویں چیز اخلاقی قوت ہے۔ روحانی اور اخلاقی قوت توحید سے حاصل ہوتی ہے۔ اور یہی اعلیٰ اور پاکیزہ عقیدہ ہی روح کو قوت بخشتا ہے۔ لیکن عرب آبادی پتھروں کے تراشے ہوئے بتوں کی پرستش کرتی تھی۔ جس کی وجہ سے اخلاقی اور روحانی قوت سے بھی محروم تھی۔

یہ حالات تھے کہ عرب میں قرآن کا نزول ہوا۔ مکی زندگی کے تیرہ سالہ عرصہ میں قرآن کی آواز کفار مکہ کے جور و ستم کی وجہ سے دبی رہی۔ کیونکہ قرآن کی دعوت اور اسکا سننا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ مدنی زندگی کا اکثر حصہ غزوات و سرایا کے شغل میں گذرا۔ اور عرب کو قرآن کے قریب آنے کا موقعہ نہ ملا۔ کچھ مدت صلح حدیبیہ کے بعد اور کچھ فتح مکہ کے بعد ایسی ہے جو چار یا پانچ سال سے زیادہ نہیں کہ قرآن کو عرب پر اثر اندازی کا موقعہ ملا۔ لیکن ہوا کیا؟ ہوا یہ کہ عرب بعد القرآن کو عرب قبل القرآن سے کوئی نسبت ہی نہیں رہی۔ اس کم مدت میں قرآن نے عرب کو کہاں سے کہاں تک پہنچا دیا۔ عرب کو قرآن نے ایسا فیض بخشا کہ وہ ایک ایسی قوم بن گئی جو تنظیم، اتحاد، اخلاق بلند خیالی، اولالعزمی، ایثار، قربانی، خدا پرستی، شجاعت، سخاوت، قناعت، عفت، پاکدامنی عدل و انصاف، امانت، دیانت میں بے مثال قوم بن گئی۔ اسی طرح جہانگیری، جہانبانی میں بھی بے نظیر تھی۔ رحمت و شفقت، عقل و تدبیر، پابندی عہد و قول، راست بازی میں کوئی قوم انکی ہمسر نہ پہلے گذری اور نہ آئندہ ممکن ہے۔ یہاں تک کہ انسانیت کی پوری تاریخ ان کے اخلاق اور خوبیوں کی نظیر پیش کرنے سے خالی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ ان آٹھ کمزوریوں کے باوجود جو اب ہم نے ذکر کیں، انہوں نے بیک وقت دنیا شرق و غرب کی دو عظیم متمدن اور ہزاروں سالوں کی مستحکم سلطنتوں کسریٰ و قیصر سے ٹکر لی۔ اور ان دونوں عظیم حکومتوں کو غبارہ بنا کر رکھ دیا۔ ان میں سے ہر حکومت دنیا میں اپنا جواب نہیں رکھتی تھی۔

اب سوال یہ ہے کہ معجزانہ اور اسباب مادیہ کے خلاف یہ سیاسی غلبہ جو عرب کو حاصل ہوا جسکی طوفانی موجیں شرق میں کاشغر اور دیوار چین سے ٹکرائیں اور مغرب میں مراکش الجزائر ہسپانیہ اور فرانس تک پہنچیں۔ اس کے اسباب یا مادی ہوں گے یا روحانی و غیبی۔ پہلا سبب جیسا کہ ہم نے ذکر کیا، عرب کو حاصل نہ تھا۔ بلکہ عرب کے حریف اور دشمن طاقتوں کو حاصل تھا۔ تو مجبوراً اقرار کرنا پڑے گا کہ یہ روحانی قوت کا کرشمہ تھا۔ جو قرآن کے فیض سے عرب کو حاصل ہوا۔ جس سے قرآن کی سیاسی عظمت و تفوق بخشی کی مقناطیسی قوت ثابت ہو گئی۔

■

مولانا مفتی امجد العلی صاحب۔ کراچی
سابق مہتمم مطلع العلوم رامپور

اعضاء انسانی سے پیوند کاری

قسط ۳

ثانیاً ہماری مسطورہ بالا فقہاء کی روایات واقوال سے آپکو یہ معلوم ہوگیا کہ فقہاء احناف وباقی تین ائمہ کا اختلاف اس صورت میں ہے جبکہ ایک شخص اضطرار کی حالت کو پہنچ جائے۔ احناف کے نزدیک انسان کے اعضاء جسمانی کے ماسوا دیگر محرمات سے تو انتفاع بقدر ضرورت مباح ہوگا، لیکن انسانی کسی عضو سے انتفاع مباح نہ ہوگا۔ بخلاف فقہاء امام مالک وشافعی وامام حنبل کے ان کے نزدیک جسطرح اضطرار کی حالت میں کسی مردار جانور یا خون یا شراب سے انتفاع جائز ہوجاتا ہے۔ اسی طرح انسانی اجزاء سے بھی جائز ہوگا۔

فقہاء حنفیہ کے نزدیک چونکہ انسان کے اعضاء کے استعمال کی حرمت اس کے اعزاز و احترام کی بنا پر ہے، اس لئے اسکو مردار جانور پر اس لئے قیاس نہیں کیا جاسکتا کہ مردار یا خون یا شراب کا حرام ہونا ان کی نجاست کی بنیاد پر ہے، دونوں مسئلوں کے حکم کی علت ایک دوسرے کی علت سے مختلف ہے۔ فقہاء مالکیہ وشافعیہ وحنبلیہ نے مردہ انسان کے اعضا یا زندہ انسان سے قطع کئے ہوئے کسی حصہ کو میت (مردار جانور) میں شامل تصور کرکے میت کا حکم مرتب کیا ہے۔ لیکن فقہاء احناف نے انسانی اعضاء یا اس کے جسم سے کسی قطع کئے ہوئے حصہ کو میت میں شامل نہیں کیا اس لئے میت (مردار) کے حکم میں بھی اس سے مختلف رکھا ہے۔ چنانچہ احناف کے علاوہ دیگر ہر سہ ائمہ میت کو اضطرار حالت میں مباح قرار دیتے ہیں لیکن احناف انسانی اعضاء یا انسان کی میت کو میت کے درجہ میں تصور کرکے حالت اضطرار میں میت کی مثل ان پر اباحت کا حکم نافذ نہیں کرتے، جہاں تک ہماری فکر ونظر کا تعلق ہے ہم حنفی فقہاء ائمہ کے قول کو کتاب وسنت سے زائد قریب پاتے ہیں۔

قرآن کریم میں حیوانات ماکولہ کا (جنکو شرع نے حلال قرار دیا ہے) پانچ مقامات پر ذکر

فرمایا گیا ہے :

۱۔ انما حرم علیکم المیتۃ والدم ولحم الخنزیر وما اھل بہ لغیر اللّٰہ۔ سورۂ بقرہ۔ ۱۷۳

۲۔ حرمت علیکم المیتۃ والدم ولحم الخنزیر وما اھل لغیر اللّٰہ بہ۔ سورۂ مائدہ۔ ۳

۳۔ قل لا اجد فی ما اوحی الیّ محرماً علی طاعم یطعمہ الا ان یکون میتۃ اودماً مسفوحاً اولحم خنزیر فانہ رجس اوفسقاً اھل بہ لغیر اللّٰہ بہ۔ سورہ انعام۔ ۱۴۵

۴۔ انما حرم علیکم المیتۃ والدم ولحم الخنزیر وما اھل لغیر اللّٰہ بہ۔ سورۂ نحل۔ ۱۱۵

۵۔ وان یکون میتۃ فھم فیہ شرکاء۔ سورۂ انعام۔ ۱۳۹

مذکورہ تمام آیات کے سیاق وسباق سے واضح ہے کہ میّت کے لفظ سے وہ مردار جانور ہیں جنکو عرب کے لوگ حلال تصور کرکے استعمال کرتے تھے اور ان کی عرف میں ایسے ہی جانوروں کو جو اپنی موت مر گئے ہوں میّت کہا جاتا تھا۔ انسان کی لاش پر یا اسکے بریدہ اعضاء پر میت کے لفظ کا استعمال نہ ہوتا تھا۔ اور نہ ان کی عرف میں یہ لفظ مردہ انسان کے لئے معروف تھا بلکہ مردہ انسان کی لاش پر میّت کا لفظ استعمال کیا جاتا تھا۔ چنانچہ قرآن کریم کی مسطورہ بالا پانچ آیات میں ان کی اسی عرف کا لحاظ فرماتے ہوئے مطعومات سے مردہ جانوروں پر میت کا اطلاق کیا گیا ہے۔ جسکا انسانی لاش سے کوئی تعلق نہیں۔ انسان کی مردہ لاش مطعومات میں شامل نہ تھی اور نہ اس پر اس لفظ کا اطلاق ہوتا تھا۔ بلکہ اس کے مقابلہ میں انسانی لاش کو مِیّت یا مَیْت کہا جاتا تھا۔ چنانچہ قرآن کریم میں مردہ انسان کے حق میں کسی مقام پر ★ سَوْأَۃَ کا استعمال فرمایا ہے۔ ارشاد ہے : ویاتیہ الموت من کل مکان وما ھو بمیّت۔ سورۂ ابراہیم۔ ۱۷ اور فرمایا ہے : انک میّت وانھم میّتون۔ سورۂ زمر۔ ۳۰۔ اور فرمایا ہے : ثم انکم بعد ذلک لمیتون۔ سورۂ المؤمنون۔ ۱۵۔ فرمایا ہے : افما نحن بمیّتین الا موتتنا الاولیٰ۔ سورۂ الصافات۔ ۵۸۔ اور فرمایا ہے : اومن کان میتاً فاحییناہ وجعلنالہ نوراً یمشی بہ فی الناس۔ سورۂ انعام۔ ۱۲۲۔ اور فرمایا : ایحب احدکم ان یاکل لحم اخیہ میتاً فکرھتموہ۔ سورۂ الحجرات۔ ۱۲ سورۂ حجرات کی یہ آیت حنفی ائمہ کے مسلک کی تائید کرتی ہے۔ یعنی کتاب اللّٰہ کے نزدیک کسی انسان سے یہ امید نہیں رکھی جاسکتی کہ وہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے۔ یہ منشاء آیت کریمہ کا اسی صورت میں مکمل طور پر تعمیل پائے گا جبکہ انسان کی مردہ لاش سے انتفاع ناجائز قرار دیا جائے۔

نیز جن آیات میں جمع کے صیغے استعمال فرمائے گئے ہیں۔ وہ تمام صیغے لفظ مُیّت یا مَیت

★ مگر میتہ کا لفظ نہیں استعمال کیا گیا ہے۔ بلکہ میت یا مَیّت کا لفظ استعمال فرمایا گیا ہے۔ اور ایک مقام پر

ہی کی جمع کے صیغے ہیں۔ چنانچہ ان دونوں لفظوں کی جمع موتٰی، اموات، میتون، میتین، حسب ذیل آیات ومقامات پر استعمال فرمائے گئے ہیں۔ سورۂ بقرہ ۱۵۴، ۲۸۔ سورۂ نحل ۲۱۔ سورۂ فاطر ۲۲۔ آل عمران ۱۶۹۔ سورۂ مرسلات ۲۶ میں لفظ اموات استعمال فرمایا گیا ہے۔ اور سورۂ بقرہ ۷۳، ۲۶۰۔ سورہ آل عمران ۴۹۔ سورۂ مائدہ میں ۱۱۰۔ انعام میں ۶، ۳۶۔ اعراف میں ۵۷، رعد میں ۳۱۔ الحج میں ۶۔ نمل میں ۸۰۔ روم میں ۵۰، ۵۲۔ یٰسین میں ۱۲۔ فصّلت میں ۳۹۔ شوریٰ میں ۹۔ احقاف میں ۳۳۔ القیامہ ۴۰۔ لفظ موتٰی استعمال فرمایا ہے۔ اور سورۂ مومنون ۱۵ و سورۂ زمر ۳۰۔ والصافات ۵۸ میں لفظ میتون ومیتین استعمال فرمایا ہے۔

ان تمام مذکورہ صدر آیات ومقامات پر مردہ انسان ہی کا ذکر ہے اور یہ تمام الفاظ لفظ مَیّت یا مَیْت کی جمع ہیں۔ کسی مقام پر لفظ میتۃ، مفرد یا اسکی جمع کا صیغہ انسان کے حق میں نہیں استعمال فرمایا گیا ہے۔ کیونکہ لفظ میتۃ کی جمع میّات یا میتات آتی ہے۔ یہ قرآن کریم کی کسی آیت میں مستعمل نہیں۔ لہذا مذکورہ آیات اس امر کی واضح دلیل ہیں کہ مردہ انسان پر میتۃ کے لفظ مفرد یا جمع کا اطلاق عرف عرب میں معروف ومستعمل نہ تھا۔ اور اس کا اطلاق انسان کی لاش یا بریدہ اعضاء پر خلاف کتاب اللہ وعرف عرب ہوگا۔

سورۂ مائدہ کے ایک مقام آیہ ۳۱ میں مردہ انسان کیلئے سوأۃ کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔ ارشاد ہے: لیریہ کیف یواری سوءۃ اخیہ۔ اور فاواری سوءۃ اخی۔ معلوم ہوا کہ قرآنی وعرف عرب کی اصطلاحی اعتبار سے مردہ انسان پر میتۃ کے لفظ کا اطلاق غیر صحیح ہے۔ اور اس لحاظ سے اسکو میتۃ کے حکم میں بحالت اضطرار بھی اس سے استفادہ نہیں کیا جاسکتا۔ لہذا فقہاء شافعیہ کا مردہ انسان کو میتۃ میں شامل کرنا اصطلاح قرآن وعرف عرب کے خلاف ہے۔ اسی طرح دیگر آئمہ کا قول۔

باقی رہا فقہاء شافعیہ کا یہ قول کہ حرمۃ الحیّ آکدُ من حرمۃ المیت۔ یعنی زندہ کا احترام مردہ انسان کے مقابلہ میں زائد قابل لحاظ ہے۔ اس موقعہ پر بھی ان حضرات کو غلط فہمی واقع ہوئی ہے۔ اسکی وجہ بالکل واضح ہے کہ کسی زندہ انسان کا کسی مردہ انسان کے گوشت کو کھالینا یہ اس زندہ انسان کی حرمت کا سبب نہیں ہوگا۔ بلکہ یہ عمل انسان کی اس شرافت اور احترام کے منافی ہوگا، جو اللہ تعالیٰ نے انسان کو دیگر حیوانات پر عطا فرمائی ہے۔ اور جس کے اعزاز واحترام کو ہر حالت میں قائم ودائم رکھنے کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف پیرایوں میں ہدایتہ بصورت تاکید

فرمائی ہے جنکو ہم اپنے مضمون ہذا کے سابقہ صفحات میں ناظرین کے سامنے پیش کر چکے ہیں۔ نیز دیگر ایسے ارشادات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کتب احادیث میں مروی ہیں جن میں اسی احترام کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ فرمایا ہے: لان یجلس احد کم علی جمرۃ فتحرق ثیابہ فتخلص الی جلدہ خیر لہ من ان یجلس علی قبر[1]۔ یعنی تمہارے لئے کسی قبر پہ بیٹھنے سے یہ بہتر ہوگا کہ آگ کے انگارے پر بیٹھو جس سے تمہارے کپڑے جل کر آگ تمہارے جسم کو جلادے۔ اور فرمایا ہے: اذی المؤمن فی موتہ کاذاہ فی حیاتہ۔ (مرقات شرح مشکوٰۃ کتاب الجنائز مطبوعہ ملتان)

حضرت عمرو بن حزم کی حدیث میں منقول ہے: قال رأنی النبی صلی اللہ علیہ وسلم متکئاً علی قبر فقال لاتؤذ صاحب ھذا القبر او لا تؤذہ۔ یعنی حضرت عمرو بن حزم نے فرمایا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے ایک قبر سے تکیہ لگائے ہوئے ملاحظہ فرمایا، ارشاد فرمایا، اس قبر والے کو اذیت نہ پہنچاؤ، یا فرمایا اس کو اذیت نہ پہنچاؤ۔

ان احادیث کے مطالعہ کے بعد یہ واضح ہو جاتا ہے کہ مردہ انسان کا احترام اس قدر کیا جانا ضروری ہے کہ اس کے مرجانے کے بعد کسی زندہ انسان سے کوئی ایسا عمل وجود میں نہ آئے جو اس مردہ کے احترام میں خلل اندازی کا باعث ہو۔ ہم سمجھتے ہیں کہ مذکورہ بالا بحث وکتاب وسنت کی پیش کردہ دلائل سے واضحہ کے بعد یہ کہنا کہ ایک مضطر اپنی زندگی محفوظ رکھنے کیلئے دوسرے مردہ انسان کا گوشت استعمال کر سکتا ہے، یا اس کے جسمانی اعضاء سے کسی قسم کا انتفاع جائز ہے۔ بڑی جرأت کا کام ہوگا۔

اس کے بعد باقی رہ جاتا ہے ایک انسان کے جسم سے دوسرے کے جسم میں خون منتقل کرنیکا مسئلہ۔ یہ امر ظاہر ہے کہ خون ہی تمام جسمانی اعضاء کی پرورش کا ذریعہ ہے اور اس لحاظ سے یہ جسم کا جزو اعظم ہے۔ اور اس حیثیت سے جو حکم انسان کے دیگر اعضاء کا بیان کیا گیا ہے۔ اس کا بھی وہی حکم ہے۔ نیز جسم انسانی سے خون کی منتقلی کی کارروائی اسطرح ہوتی ہے کہ اولاً اس کو آلات کے ذریعہ ایک ایسی ٹیوب (بوتل) میں جمع کر لیا جاتا ہے کہ اس کی رقت وسیلان بدستور قائم رہے اور پھر یہ جسم سے خارج کیا ہوا بوتل کا خون ضرورت کے موقعہ پہ دوسرے انسان کے جسم میں پہنچا دیا جاتا ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ ایک انسان کے جسم میں سوئی نما آلہ لگا کر اور اسی طرح کا دوسرا آلہ دوسرے

---

[1] مشکوٰۃ بحوالہ مسلم صفحہ ۱۴۸۔ مطبع اصح المطابع کراچی۔

کے جسم میں پیوست کر کے خون کو اس جسم سے دوسرے میں منتقل کیا جائے اگر ایسا ہی کیا جائے تب بھی خون آنے میں آنے کے بعد اول جسم سے خارج شدہ ہی تصور کیا جائے گا۔ اب ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ یہ خون (دم مسفوح) بہنے والا خون قرار پائے گا، جو نجس ہوگا۔ اور دم مسفوح کا حکم قرآن استعمال بغیر حالت اضطرار ممنوع ہے۔ البتہ اضطرار کی حالت میں مباح ہے۔ لیکن انسان کے خون میں صرف ایک ہی علت نجاست موجود نہیں بلکہ اس میں ایک دوسری علت بھی موجود ہے اور وہ اسکی فضیلت و کرامت ہے جسکی بنا پر دیگر اعضاء جسم کی مثل اس کا استعمال بطور معالجہ حرام ہوگا۔ اگر محض نجس ہونے کی بنا پر ایسا ہوتا تو ممکن تھا کہ حیوانات کے دم مسفوح کی طرح بحالت اضطرار اس کا استعمال مباح کر دیا جاتا۔ اور جانوروں کے حرام پیشاب پر بھی قیاس کر لینا ممکن ہو جاتا۔ لیکن ہماری سابقہ تحقیق کے پیش نظر اس کے استعمال کا حرام ہونا صرف اس کے نجس ہونے کی بنا پر نہیں ہے۔ باقی رہا یہ سوال کہ انسان کا خون اگرچہ اس کے جسم کا ایک جزء ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ اسکو کسی نجس شئے سے مشابہت دی جائے بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ انسان کے کسی ایسے جزء کی مثل قرار دیا جائے جو پاک اور بوقت ضرورت اس کا استعمال بھی جائز ہو۔ جیسا کہ بچہ کی ماں کا دودھ کہ یہ پاک ہے اور بوقت ضرورت اس کا استعمال بھی جائز ہے۔ جیسا کہ عالمگیری و دیگر کتب فقہ میں ہے کہ: لاباس بان یسعط الرجل بلبن المرأۃ ولیشربہ للدواء۔ یعنی اس امر میں کوئی مضائقہ نہیں کہ ایک انسان کسی عورت کے دودھ کو ناک کے ذریعہ اوپر چڑھالے یا منہ سے پی جائے کسی مرض کے علاج کیلئے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ انسان کے خون کو انسان (عورت) کے دودھ سے تشبیہ دینا صحیح نہیں۔ اس کی ایک وجہ تو وہی ہے کہ خون جسم سے خارج ہونے کے بعد نجس ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حنفی ائمہ کے نزدیک جبکہ وضو کی حالت میں کسی کے جسم سے بہنے والا خون نکل کر جاری ہو جائے (بہہ جائے) تو وضو جاتا رہے گا۔ اگر بقدر درہم کپڑے پر لگ جائے تو کپڑا ناپاک ہو جائے گا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ماں کا دودھ اللہ تبارک و تعالیٰ نے بچے کیلئے اسکی پرورش کا ذریعہ بنایا ہے اسکی تخلیق ہی تغذیہ کیلئے ہے اور پاک ہے۔ چنانچہ اگر عورت وضو کی حالت میں بچے کو دودھ پلا دے تو اس کا وضو قائم رہے گا۔ اور کپڑے یا جسم پر لگ جانے سے کپڑا یا جسم ناپاک نہ ہوگا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ خون کو ماں کے دودھ سے کوئی مشابہت نہیں، تاکہ دودھ پر قیاس کر کے اس سے معالجہ کو مباح قرار دیا جائے۔ خون کی تمام تر مشابہت حیوانات کے خون سے یا شراب سے یا پیشاب

سے قرار پاتی ہے۔ اور ایسی صورت میں بغیر حالت اضطرار کے اس کا معالجہ میں استعمال کرنا جائز نہ ہوگا۔ البتہ بحالت ضرورت (اضطرار) مباح ہو سکتا تھا۔ لیکن جیسا کہ ہم نے سابقہ سطور میں بیان کیا ہے۔ اس کا استعمال محض اس کے نجس ہونے کی بنا پر نہیں ہے۔ بلکہ اسکی عظمت و تکریم کی بنا پر ہے۔ اسی لئے ایک کنیز کے دودھ کو اس کا آقا دوھ کر فروخت نہیں کر سکتا۔ جیسا کہ ہم نے اپنے مضمون کے وسط میں رد المحتار کے حوالہ سے نقل کیا ہے۔ جسکی اصل عبارت حسب ذیل ہے۔

وشعر الانسان لکرامۃ الآدمی ولو کافراً، ذکرہ المصنف وغیرہ فی بحث شعر الخنزیر، قولہ ذکرہ المصنف، حیث قال والآدمی مکرم شرعاً وان کان کافراً فایراد العقد علیہ وابتذالہ بہ والحاقہ، بالجمادات اذلال لہ اھ ای ھو غیر جائز وبعضہ فی حکمۃ وصرح فی فتح القدیر ببطلانہ، قلت وفیہ انہ یجوز استرقاق الحربی وبیعہ وشرائہ وان اسلم بعد الاسترقاق۔ والبیع والشراء بلے محلہ نفس الحیوانیۃ فلذا لایملک بیع لبن امتہ فی ظاہر الروایۃ کما سیاتی اھ۔ یعنی انسان کے بالوں کا فروخت کرنا جائز نہیں۔ آدمی کی بزرگی کی بنا پر خواہ وہ کافر ہی کیوں نہ ہو۔ مصنف تنویر الابصار وغیرہ نے اس کا ذکر خنزیر کے بالوں کی بحث میں کیا ہے۔ چنانچہ انہوں نے کہا ہے کہ آدمی چونکہ شرعاً مکرّم (محترم) ہے، خواہ وہ کافر ہی کیوں نہ ہو۔ لہذا اسکی ذات پر خرید و فروخت کا عقد منعقد کرنا اور اس طریقہ سے اسکو ذلیل کرنا، جمادات کی صف میں شمار کرنا اسکی ذات کی (تحقیر) ہوگی۔ اور یہ امر جائز نہیں ہے۔ اور اس کے جز (حصہ) کا حکم وہی ہے جو اس کے کل کا حکم ہے۔ فتح القدیر میں اسکی بیع کے باطل ہونے کی صراحت کر دیگئی ہے۔ لیکن اس مقام پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ ایک دار کفر کے کافر کا غلام بنا لینا اور اسکی خرید و فروخت تو جائز ہے۔ خواہ غلام بنا لینے کے بعد وہ مسلمان ہی ہو گیا ہو۔ اس کا جواب یہ ہوگا کہ جس امر کو یہاں حرام قرار دیا جا رہا ہے۔ وہ اسکی تخلیقی صورت کی تکریم کی بنیاد پر ہے۔ (اسکو بگاڑ دینا حرام ہے)۔ یہی وجہ ہے کہ کسی میت کی ہڈی خواہ وہ کافر ہی ہو توڑنا حرام ہے۔ اور جس چیز کو غلام بنایا جاتا ہے، اسکی خرید و فروخت کی جاتی ہے۔ وہ اسکی نفسِ حیوانیہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک آقا اپنی مملوکہ کنیز کا دودھ ظاہر روایت کے مطابق فروخت نہیں کر سکتا۔ جیسا کہ عنقریب آنے والا ہے۔ اھ

اس روایت اور دیگر کتب فقہ حنفی کی اسی قسم کی روایات سے یہ امر بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ انسان کے جز و کل سے انتفاع و استعمال کے حرام ہونے کی علت فقہاء امت کے نزدیک اس کا اکرام و احترام ہے نہ کہ مردار کے اعضاء کی مثل نجس و ناپاک ہونا۔ لہذا انسان کے خون کو ماں کے دودھ سے تشبیہہ دینے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اللّٰھم اھدنا الصراط المستقیم۔ ■■

مولانا محمد شہاب الدین ندوی
فرقانیہ اکیڈمی۔ چک بانا در بنگلور نارتھ (انڈیا)

انسانیت دوراہے پر

انسانیت
کی تعمیر میں
علم جدید
اور
تہذیبِ جدید
کی
ناکامی

انسانیت کیا ہے؟ انسان محض ایک حیوانی وجود یا ڈارون کے نظریہ کے مطابق ایک "بڑھیا جانور" ہی نہیں بلکہ وہ صفت نطق و گویائی سے بھی متصف ہے۔ وہ محض گوشت پوست، خون اور ہڈیوں ہی سے مرکب نہیں بلکہ کچھ جذبات و احساسات بھی رکھتا ہے۔ وہ ہاتھ پیر، رنگ و روپ اور بطن و فرج ہی کا مجموعہ نہیں بلکہ عقل و شعور اور فہم و ادراک کی قوتوں سے بھی مالا مال ہے۔ وہ محض ایک جانور ہی نہیں بلکہ ایک ایسے حیرت انگیز ذہن و دماغ کا بھی مالک ہے جس کے سہارے وہ کسی بھی چیز کے متعلق مختلف خیالات و نظریات قائم کرنا، خیر و شر میں تمیز کرنا اور منطق و استدلال سے کام لیتا ہے۔

مختصر یہ کہ انسان کا ظاہری و جسمانی نظام ایک حقیقت ہے تو اُس کا باطنی و اندرونی نظام بھی ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے۔ جس کا انکار کر کے ان مظاہر کی کوئی بھی تشفی بخش تشریح و توجیہہ نہیں کی جا سکتی۔ ایک کو ہم جسم سے تعبیر کرتے ہیں تو دوسرے کو "روح" سے موسوم کر سکتے ہیں۔ کھانا پینا، سونا، شادی بیاہ کرنا اور جسمانی راحت و آسائش وغیرہ جسم کے مظاہر ہیں تو سوچنا، سمجھنا، محسوس کرنا، نطق و گویائی، عقل و شعور، ذہن و دماغ، قوتِ حافظہ اور دلیل و استدلال وغیرہ سے کام لینا روح کے خواص۔ اوّل سے جسم کا نشو و نما ہوتا ہے تو دوسرے سے روح کی آبیاری ہوتی ہے۔

روح کے خواص و اثرات ہی انسان کے عمل و کردار کو جنم دیتے اور اس کے لئے

راہ عمل متعین کرتے ہیں۔ روح کا یہ عمل جب اپنی صحیح سمت اور صحیح رُخ میں رواں رہتا ہے تو اس سے حسن اخلاق اور تہذیب وشائستگی کے چشمے پھوٹتے ہیں۔ مگر جب اس کا رُخ اور بہاؤ غلط سمت کی طرف ہو جاتا ہے۔ تو پھر بد اخلاقی اور حیوانیت کا عروج ہونے لگتا ہے۔ یہی وہ نقطہ ہے جہاں سے حیوانیت اور انسانیت کی راہیں الگ الگ ہو جاتی ہیں۔ اس دو آبے پر پہنچ کر "ڈارونیت" اور "آدمیت" کی منزلیں جدا جدا نظر آنے لگتی ہیں۔ اور یہی وہ مرکزی مقام ہے جہاں پر انسان بقیہ تمام انواع حیات سے نمایاں وممتاز نظر آنے لگتا ہے۔ اور لاکھوں انواع حیات میں یہ مرتبہ ومقام سوائے انسان کے کسی اور کو نہیں مل سکا۔

ولقد کرمنا بنی آدم وحملناھم فی البر والبحر ورزقنٰھم من الطیبٰت وفضلناھم علیٰ کثیر ممن خلقنا تفضیلاً۔ اور ہم نے آدم کی اولاد کو یقیناً عزت بخشی اور انہیں بر و بحر میں سواریاں عطا کیں۔ (خورد ونوش کی) عمدہ چیزوں سے انہیں نوازا اور بہت سی مخلوقات پر انہیں کلی فضیلت بخشی (بنی اسرائیل: ۷۰)

تہذیب جدید کے عناصر | یہ ایک المیہ ہے کہ دورِ جدید میں جسم کی نشوونما اور اسکی آرائش وزیبائش پہ تو بہت زیادہ زور دیا گیا۔ چنانچہ سائنس کی تقریباً تمام ترقیاں جسم انسانی کو زیادہ سے زیادہ آرام وراحت پہنچانے ہی کے لئے ہو رہی ہیں۔ مگر روح اور اسکی غذا کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا، حالانکہ سب سے زیادہ زور اسی پہ دینا چاہیئے تھا۔

تہذیبِ جدید کے علمبرداروں نے مذہب سے بغاوت کرکے روح اور اس کے مظاہر کو سمجھنے میں دانستہ یا نادانستہ طور پہ سخت ٹھوکر کھائی، اور مادہ اور اس کے مظاہر ہی کو سب کچھ قرار دے کر انسان کو اخلاقی قیود سے آزاد کر دیا، نتیجہ یہ ہوا کہ انسانی معاشرہ میں ایک خوفناک قسم کی بے یقینی پھیل گئی، انسانیت دکھی ہو گئی، افسردگی، مایوسی اور بے چینی کے جراثیم سرایت کر گئے۔ جنہوں نے خود غرضیوں اور تن آسانیوں کو جنم دیا۔ جب کوئی مقصد حیات ہی نہ رہا اور زندگی کے مصائب وآرام میں سہارا دینے والی ہستی کا مرکزی تصور ہی سرے سے مفقود ہو گیا تو پھر غم غلط کرنے اور ہموم وافکار سے پیچھا چھڑانے کے لئے عیاشیوں اور رنگ رلیوں کے نئے نئے طریقے سوچے گئے اور عشرت کدوں کو نئے سرے سے اس طرح آراستہ کیا گیا کہ حیوانیت کے سابقہ تمام ریکارڈ ٹوٹ گئے۔ بقول اقبالؒ ؎

حیات تازہ اپنے ساتھ لائی لذتیں کیا کیا رقابت، خودفروشی، ناشکیبائی، ہوسناکی

علم جدید کی ناکامی | ایک طرف تو یہ حال ہے اور دوسری طرف طبیعی و اجتماعی علوم کی بڑی ترقی اور فراوانی ہوتی اور ہر شعبہ علم میں "معلومات" کا ایک انبار لگ گیا۔ اب حال یہ ہے کہ اگر ایک شخص کسی ایک ہی علم کے حصول میں اپنی پوری عمر کھپا دے تب بھی وہ اس کے مالہ وماعلیہ کا کلی احاطہ مشکل ہی سے کر سکتا ہے، مگر اس بے مثال علمی ترقی اور عقلی ارتقاء کے باوجود انسان نہ تو مادہ اور اس کے مظاہر ہی کے متعلق مکمل علم حاصل کر سکا ہے اور نہ روح اور اس کے مظاہر ہی کو کما حقہ، سمجھ سکا ہے۔ یعنی مادہ اور روح کے متعلق کسی ایسے قطعی علم یا حتمی صداقت تک نہیں پہنچ سکا جس کو "عقیدہ" یا آخری بات کا درجہ دیا جا سکے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسانی علم مسلسل اور لگاتار ارتقائی منزلوں سے گزر رہا ہے۔ اور اس کا یہ "علمی سفر" کہیں رکتا ہوا یا اپنی آخری سرحدل تک پہنچتا ہوا دکھائی نہیں دیتا، جس کے باعث یہ فیصلہ کر دیا جائے کہ اب مزید تلاش و جستجو کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ جس کا جی چاہے وہ طبیعی علوم (PHYSICAL SCIENCES) اور ان کے ارتقاء کی تاریخ کا مطالعہ کرے۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان نے تمام علوم پڑھ لئے، اور قدرت کے بہت سے مخفی رازوں کو بے نقاب کر دیا۔ لیکن خود اپنی ہستی کو سمجھ نہیں سکا اور عرفان نفس کا پتہ لگا نہ سکا بلکہ اس کا وجود اب تک اس کی نظروں میں ایک راز بنا ہوا ہے جو کسی طرح کھلتا نظر نہیں آتا۔ بلکہ علم کی جیسے جیسے ترقی ہو رہی ہے اسی نسبت سے اسکا وجود مزید پر اسرار بنتا چلا جا رہا ہے۔

منزل کا فقدان | آج انسانی تمدن بے انتہاء ترقی کر گیا ہے، یہ ایک حقیقت ہے۔ اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس کا ظاہری و مادی علم انتہائی بلندیوں کو چھو رہا ہے۔ چنانچہ وہ مادی قوتوں کو زیر کر کے اجرام سماوی پر ڈورے ڈال رہا ہے۔ اور کہکشاؤں میں تاک جھانک کر رہا ہے۔ مگر اس کے برعکس اس کی روحانی ترقیاں معکوس ہو گئی ہیں۔ اور روح کی غذا مفقود ہو گئی ہے۔ نتیجہ یہ کہ جسم و روح کے درمیان فاصلہ بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے اور انسانیت کی منزل نظروں سے اوجھل ہوتی جا رہی ہے۔

آج کا انسان ایک دوراہے پر کھڑا ہے اور اس کو اپنی منزل کی کچھ خبر ہی نہیں رہ گئی ہے۔ کہ وہ کدھر جا رہا ہے۔؟ عقلاء و دانشور حیران و سرگرداں ہیں کہ اسکی اصل منزل کیا ہے اور کیا ہونی چاہیئے۔؟ ہر طرف بے یقینی، ظن و تخمین، تشکیک و ارتیاب اور تخیلات و مفروضات کی گھٹائیں چھائی ہوئی ہیں۔ بے چینی، عدم طمانیت، ذہنی پراگندگی اور انتشار و اضطراب کی ایک

عجیب و غریب کیفیت ہے، جو پورے عالم انسانی پر طاری ہوتی چلی جا رہی ہے۔ تہذیب جدید کے یہ لادینی اور عالمگیر سوغات ہیں، جنہوں نے ذہنوں کو مفلوج و ماؤف کر دیا ہے اور پورا ماحول مسموم و زہر آلود ہو چکا ہے۔ بقول علامہ اقبالؒ ؎

یہ عیش فراواں یہ حکومت یہ تجارت ‌ ‌ ‌ دل سینۂ بے نور میں محروم تسلی
تاریک ہے افرنگ مشینوں کے دھوئیں سے ‌ ‌ ‌ یہ وادیٔ ایمن نہیں شایان تجلی

خطرناک صورت حال | موجودہ "مہذب" انسان کے سینے میں یقین و عرفان کی چنگاریاں بجھ چکی ہیں۔ اس کا ظاہر اگرچہ نہایت آراستہ، بھڑکدار، روشن تر اور نگاہوں کو خیرہ کرنے والا دکھائی دیتا ہے، مگر اس کا باطن نہایت درجہ سیاہ، تاریک تر، اور گھناؤنا ہو چکا ہے۔ درحقیقت وہ اپنی تمام ترقیوں کے باوجود جہالت و بے یقینی کی تہہ بہ تہہ تاریکیوں سے باہر نہیں نکل سکا ہے۔

اس کے ظاہر و باطن کا یہ تضاد اس لئے پیدا ہوا کہ اس نے روح اور اس کے تقاضوں کو سمجھنے میں فاش غلطی کی۔ خدائی ہدایت و رہنمائی سے بے نیاز ہو کر اپنی راہ آپ متعین کرنے کے دعوائے پندار میں سر رشتۂ حیات گم کر بیٹھا۔ انانیت کے چکر میں ایسا پھنسا کہ منزل کے جو دھندلے سے نقوش باقی رہ گئے تھے وہ بھی مٹ گئے۔ انسانی و اخلاقی اقدار سے بغاوت کی لہریں ایسی اٹھیں کہ جنون میں راہ کے نشانات اور سنگہائے میل تک کو اکھاڑ پھینک دیا۔ اب اس کے سامنے بالکل اندھیرا چھایا ہوا ہے۔ اور ہر چیز مشکوک و بے یقینی نظر آرہی ہے۔ ہر طرف غمگینی اور یاس انگیزی کی اندوہناک بدلیاں چھائی ہوئی ہیں۔ ایک بے کیف سی سُونی سُونی زندگی ہے۔ جو محض مشینوں کے سہارے رواں دواں ہے۔ ایک مصنوعی اور بناوٹی زندگی ہے جو اندرونی جذب و سوز سے خالی ہو چکی ہے۔ اور بجائے قلبی سکون و اطمینان کے، جو خدا پرستی کا لازمہ ہے، قلبی اضطراب و اضطرار اور بے چینی و بے قراری ایک عالمگیر شکل اختیار کرتی جا رہی ہے، جو بے خدائیت کا لازمی نتیجہ اور لادینی تہذیب کا سب سے بڑا کرشمہ و تحفہ ہے۔ یہ قلبی اضطراب و انتشار اندر ہی اندر ایک آتش فشاں لاوے کی طرح پک رہا ہے جو تمام باقیات انسانی کو خس و خاشاک کیطرح بہائے جانا چاہتا ہے۔ موجودہ تمام معاشی، تمدنی اور سیاسی فتنے اور جھگڑے فسادات اس اندرونی اضطراب و انتشار کے مظاہر اور اس کی علامتیں ہیں جو خطرہ کے نشان کو پار کر چکی ہیں۔ اور بیرومیٹر ایک خطرناک طوفان کی خبر دے رہا ہے۔ مختصر یہ کہ آج انسان انسان ہونے کے باوجود انسانیت کے لئے ترس رہا ہے۔ اور وہ دھرتی پر آپ بوجھ دکھائی دیتا ہے۔

بقول علامہ اقبال ؎

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا — اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا — آج تک فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا — زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا

اصل علاج | اب سوال یہ ہے کہ ظاہر و باطن کے اسی تضاد کا علاج کیا ہے -؟ موجودہ روحانی بیماریوں کو کسطرح دور کیا جا سکتا ہے -؟ کیا موجودہ بگڑی ہوئی انسانیت کی اصلاح ناممکن ہے - کیا موجودہ معاشرتی، تمدنی، سیاسی اور بین الاقوامی خرابیوں کو دور نہیں کیا جا سکتا ہے -؟ کیا انسان تڑپ تڑپ کر اور بلک بلک کر ختم ہو جائیگا - یہ ساری خرابیاں دور ہوں تو آخر کیسے اور کیونکر؟

یہ ہیں وہ سوالات جو آج دانشوروں اور انسانیت کے بہی خواہوں کو پریشان کئے ہوئے ہیں - تو اس سلسلے میں یہ بنیادی حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہئے کہ تاریخ انسانی کا مشاہدہ اور فیصلہ یہ ہے کہ انسانی سیرت و کردار کو درست کرنے اور ہر قسم کی اخلاقی خرابیوں کے سدباب کے لئے مذہب سے بڑھ کر موثر اور طاقتور محرک کوئی دوسرا نہیں ہو سکا ہے - انسانی ذہن و دماغ کو قابو اور کنٹرول میں رکھنے والی قوت مذہب ہی کی رہی ہے - یعنی خوف خدا اور خوف آخرت کے تصورات ہی انسانوں کو برائیوں سے روک سکتے ہیں - یہی وہ آزمودہ نسخہ ہے جس کو اپنا کر موجودہ بے مہار معاشرہ کو قابو میں کیا جا سکتا ہے - اس کے علاوہ کسی دوسرے علاج سے قطعاً کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا - حکومتی سطح پر محض چند قوانین پاس کر دینے سے کوئی اصلاح نہیں ہو سکتی - کیونکہ سرکاری قوانین محض ظاہری اعتبار سے ہی نافذ ہو سکتے ہیں - دل و دماغ پر حکمرانی نہیں کر سکتے - بلکہ آجکل تو حالت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ حکومت کے قوانین کی علانیہ خلاف ورزی کی جا رہی ہے - اور دستوری ضوابط کی دھجیاں اڑائی جا رہی ہیں ـــ اور حکومت کی پوری مشینری قطعاً ناکارہ بلکہ خاموش تماشائی نظر آ رہی ہے -

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

ایک سوال | اب سوال صرف یہ رہ جاتا ہے کہ کیا دنیا میں کسی ایسے مذہب کا وجود بھی ہے جو موجودہ دکھی اور بیمار انسانیت کو بچا سکتا ہو -؟ اور اس کے دکھوں کا مداوا کر سکتا ہو -؟ کیا کوئی ایسا مذہب ہو بھی سکتا ہے جو موجودہ بے یقینی کی جگہ یقین کی فضا بحال کر سکے --؟ جو ذہنی و فکری کشمکش کی جگہ سکون و طمانیت عطا کر سکے -؟ جو بے روح اور مردہ دلوں میں

سوز و گداز پیدا کر سکے۔؟ جو باہمی نفرت و عداوت کی دیواروں کو منہدم کر کے محبت و مروّت کے آشیانے تعمیر کر سکے۔؟ جو جبر و استبداد اور ظلم و زیادتی کو ختم کر کے جملہ حقوق انسانی کو بلاتفریق مذہب و ملت بحال کر سکے۔؟ مختصر یہ کہ کیا اس وقت ایسا کوئی انسانیت نواز، وسیع القلب اور غیر متعصب دین و مذہب موجود ہے جو موجودہ تمام اخلاقی، معاشرتی، تمدنی، سیاسی، اور بین الاقوامی خرابیوں کا انسداد کر کے ایک صالح، پاکیزہ اور تمام مثالی معاشرہ کی تشکیل کر سکتا ہو؟

روشنی کا مینار تو جواب یہ ہے کہ روئے زمین پر اس وقت صرف ایک ہی ایسا مذہب پایا جاتا ہے جو ان تمام صفات و خصوصیات کا حامل ہے۔ اور وہ ہے اسلام جس کو دین فطرت اور دین رحمت بھی کہا جاتا ہے۔ آپ قرآن اور حدیث کی تمام تعلیمات کا جائزہ لے لیجئے۔ آپ پائیں گے کہ خدا اور بندے کے درمیان تعلقات کی استواری کے بعد سب سے زیادہ زور انسان کو تہذیب و شائستگی سکھانے اور باہمی روابط درست یا حقوق العباد کے تحفظ ہی پر دیا گیا ہے۔ حقوق العباد ایک جامع اصطلاح ہے، جس میں معاشرتی، تمدنی، سیاسی اور بین الاقوامی تمام اجتماعی روابط و تعلقات آجاتے ہیں۔

اسلام نے انسانی مساوات، رحمدلی، ایثار اور تمام قوموں سے عدل گستری پر خصوصی توجہ مبذول کی ہے۔ اور اسلام کو دنیا سے روشناس کرانے والے ہادیٔ برحق صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی خود ان تمام صفات و تعلیمات سے مزین و آراستہ رہی جن کا اسلام علمبردار ہے۔ اسلام نے جو کچھ نظری تعلیم پیش کی پیغمبر اسلام اس کا عملی نمونہ رہے ہیں۔ چنانچہ آپ ایک کامیاب پیغمبر ہونے کے ساتھ ساتھ سب سے زیادہ شریف، مہذب، راست باز، امین صادق، خوش اخلاق، سب سے بڑے مصلح، ہادی، رہبر، ایک کامیاب مرشد، استاد، قاضی، مقنن، ایک بہترین باپ شوہر، پڑوسی، شہری، ایک بے مثال لیڈر، سیاست دان، فوجی جرنیل اور ایک مثالی عابد، زاہد، حق گو، خدا ترس، غرض ہر حیثیت سے مکمل، بے عیب اور فقید المثال انسان رہے ہیں۔ یہ کوئی شاعری نہیں بلکہ آپ کی حیات طیبہ کے یہ سارے نقوش اور آپ کی پاکیزہ سیرت کے تمام انوار تاریخ کے ریکارڈ میں پوری طرح محفوظ و موجود ہیں۔ پوری انسانی تاریخ گواہ ہے اور تمام ناقدین کا متفقہ فیصلہ ہے کہ نظری اعتبار سے اسلام سے بہتر مذہب اور عملی اعتبار سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کامل، بے داغ، اور مثالی انسان کوئی اور نہیں گزرا ہے۔

جو تمام طبقات انسانی کے لیئے، بلا تفریق مذہب و ملت، ایک مثالی نمونہ اور آئیڈیل کردار ہو۔
لہٰذا موجودہ بگڑے ہوئے انسانی معاشرہ کی اگر اصلاح ہو سکتی ہے تو صرف حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیش کردہ ضابطۂ حیات اور نمونۂ زندگی کو اپنا کر ہی ہو سکتی ہے۔ نیز موجودہ زخموں سے نڈھال اور کراہتی ہوئی انسانیت کی مرہم پٹی اگر ممکن ہے تو صرف پیغمبر اسلام کی سیرت طیبہ ہی کی بدولت اسلام کا بنیادی اور اہم ترین مقصد تمام انسانوں میں تہذیب اخلاق، تزکیہ نفس اور ایمان و احتساب کے اعلیٰ صفات پیدا کرنا ہے۔ اور اس کی تمام تعلیمات ہر دور کے تقاضے کے مطابق افراط و تفریط سے پاک اور متوازن ہیں جن سے انسانیت کی تکمیل ہوتی ہے۔
آج دنیا کو کوئی بھی ازم اور کوئی بھی فلسفہ بچا نہیں سکتا۔ کیونکہ تمام انسانی نظامات اور فلسفے وقتی و عارضی اور بے عمل و بے کردار ہوتے ہیں۔ محض چکنی چپڑی باتوں، سطحی و خوشنما نعروں اور بلند بانگ و کھوکھلے دعوؤں سے دنیا کی کایا پلٹ نہیں سکتی۔ اور کوئی پائیدار و دائمی نتائج برآمد نہیں ہو سکتے۔ بلکہ یہ سارے گمراہ کن ازم اور فلسفے یا تو اپنے خود غرضانہ مقاصد کو بروئے کار لانے کے لئے گھڑے جاتے ہیں یا پھر بے عملی، کام و ذہن کی آسودگی اور نفع عاجل کو فروغ دینے کی خاطر۔ آپ کسی بھی ازم یا فلسفے کا تحلیل و تجزیہ کیجیئے ہر ایک کی تہہ میں آپ کو یہی بنیادی عناصر ملیں گے۔

خدائی علم اور انسانی علم کی خصوصیات | یہ کوئی خوش عقیدگی نہیں بلکہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ انبیائے کرام کی تعلیمات میں ظن و تخمین، شک و شبہ، شاعرانہ تخیلات اور فلسفیانہ قسم کے مفروضات اور دور از کار تاویلات کا کوئی گزر نہیں ہوتا۔ بلکہ ان کی تعلیمات کا ایک ایک حرف اور ایک ایک جز و جزم و یقین و اعتماد و قطعیت سے پُر ہوتا ہے جس سے علم انسانی سرے سے ناآشنا ہے۔ اس کا ثبوت اسلام کے وہ محکم اور ابدی عقائد و تعلیمات ہیں جن کو علم انسانی عقل سلیم اور منطق سلیم کی رو سے، اب تک چیلنج نہیں کر سکا ہے۔ اور جن سے بہتر تعلیمات کا نظارہ چشم فلک اب تک نہیں کر سکا ہے۔ حالانکہ اس کے مقابلے میں انسانی نظریات و مفروضات کے زمین و آسمان ہی بدل گئے ہیں۔ کوئی دن ایسا نہیں گزرتا جس میں انسانی ساختہ کوئی نہ کوئی فلسفہ ٹوٹتا اور اس کی جگہ کوئی دوسرا نظریہ و مفروضہ لیتا ہوا نظر نہ آتا ہو۔
پھر یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ دنیا کے تمام طبیعی اور شوشل علوم بھی مل کر اور کل فلسفے اور نظامات بھی اکٹھا ہو کر نوع انسانی کے لیئے ایک قطعی، غیر متغیر اور سب کے لئے یکساں طور پر

قابل عمل ضابطہ حیات وضع کرنے میں پوری طرح ناکام ہو چکے ہیں۔ اپنے اپنے فن کے ماہرین کی پوری پوری ٹیمیں مل کر بھی چند ایسے ضوابط تک بنانے سے عاجز آ چکے ہیں جو ایک دو صدیاں نہیں بلکہ محض چند سالوں تک ہی بغیر کسی ترمیم و اضافے کے چل سکیں۔ اس کا نظارہ مختلف ممالک کے دستوروں اور اسمبلیوں کے بدلتے ہوئے قوانین سے کیا جا سکتا ہے۔ حالانکہ انسان کے سامنے انسانی اجتماعیات کی پوری تاریخ موجود ہے، عمرانیات کے ایک ایک پہلو پر نظر ہے اور تمام علوم جدیدہ میں بے انتہا ترقی کر لی ہے۔

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے، انسان کی اس ناکامی کا راز یہ ہے کہ انسان نہ تو مادہ ہی کا مکمل علم حاصل کر سکا ہے اور نہ روح اور اس کے مظاہر ہی کو ٹھیک ٹھیک سمجھ سکا ہے۔ لہٰذا وہ مادہ اور روح سے مرکب ایک انسان کے لئے کوئی ایسا مکمل اور لافانی ضابطہ کیسے وضع کر سکتا ہے۔ جب کہ وہ اس کی اصلیت ہی سے ناواقف ہو! حقیقت یہ ہے کہ انسان کی موجودہ معلومات علم سے زیادہ جہل سے بہت زیادہ مشابہت رکھتی ہیں۔ اور وہ ذہنی و فکری اعتبار سے انتہائی پسماندہ نظر آتا ہے۔

ایک زندہ معجزہ | اسلام نے چودہ سو سال قبل جو اصول دنیائے انسانیت کے روبرو پیش کئے تھے اور معاشرہ کی اصلاح و تربیت کے لئے جو جامع ضوابط وضع کئے تھے انسان کے تمام علوم اور اس کے سارے تجربات مل کر بھی اُن پر اب تک کوئی اضافہ نہیں کر سکے ہیں۔ اور نہ وہ کبھی فرسودہ یا ناقابل عمل ہی قرار پا سکے ہیں۔ اور نہ ہی ان میں کبھی حک و فک اور ترمیم و اضافہ کی ضرورت ہی محسوس ہو سکی ہے۔ یہاں پر ان تجدد نوازوں سے کوئی بحث نہیں ہے جو محض ذہنی و فکری افلاس، مغرب زدگی اور مرعوبیت کے باعث اسلام کے محکم اور ابدی اصولوں میں بھی تبدیلی کے خواہشمند ہیں۔

اور دوسری حیثیت سے اسلام نے اپنے پیش کردہ عقائد و تعلیمات کے ثبوت میں کائنات کے جن حقائق کو پیش کیا تھا ان کی صداقت آج علوم جدیدہ خصوصاً علوم سائنس کی ترقی کی بدولت روشن ہوتی چلی جا رہی ہے۔ یہ حتمی و یقینی علم جو ظن و تخمین اور ہر قسم کی شاعرانہ خیال آرائیوں سے یکسر پاک ہے۔ اسلام کا ایک شاندار اور تحیر خیز معجزہ ہے جس کی مثال پیش کرنے سے پورا علم انسانی اور اس کا کل لٹریچر عاجز و بے بس ہے۔

یہ قطعی و یقینی علم ایک ایسی ہستی کی موجودگی کی نشاندہی کرتا ہے۔ جو اس کائنات میں ازل سے

موجود ہے اور جس کے علم میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ لہٰذا وہی وہ واحد ہستی ہو سکتی ہے جو تمام انسانوں کے لئے ایک محکم، ابدی، ناقابل تغیر اور ہر زمانے کی ضروریات پر حاوی ایک مکمل اور بے عیب ضابطہ تجویز کرے۔

انسانیت کا تقاضہ | انسانوں کے لئے یہ محکم اور ابدی قانون چند منتخب بندوں کے ذریعہ پہنچایا جاتا ہے۔ جو اولین طور پر خود اس قانون پر چلنے والے اور اس کے امین و رازداں ہوتے ہیں۔ اس بنا پر ان کی سیرتیں امتیوں کے لئے نمونہ اور آئیڈیل قرار دی جاتی ہیں۔

اس ابدی و سرمدی علم کا تقاضہ ہے کہ انسان اپنی عجز و نارسائیوں کا اعتراف کرتے ہوئے بارگاہ احدیت میں اپنی جبین نیاز جھکا دے اور اپنی عبدیت کا عملی ثبوت پیش کرے۔ اب رہی یہ بات کہ اظہار عبدیت کے کیا طریقے ہوں۔؟ اور مراسم عبودیت کیا ہیں۔؟ تو یہی بات انبیائے کرام کی معرفت بتائی اور سکھائی جاتی ہے۔ مراسم عبودیت یا اپنی زندگی کے طور طریقوں کو سیکھنے ہی کا نام "شریعت" ہے، جس سے مذہب بحث کرتا ہے۔ اس جذبۂ عبودیت کے اظہار کی اعلیٰ اور نمایاں ترین مثالیں چونکہ انبیائے کرام کی سیرتوں ہی میں ملتی ہیں اس لئے انبیائے کرام کی پاکیزہ اور بے عیب سیرتیں رہتی دنیا تک نوع انسانی کے لئے روشنی کا منارہ قرار دی گئی ہیں۔ ان میں سے اعلیٰ اور مکمل ترین سیرت خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے جس سے آج انسانیت کی تکمیل ہو سکتی ہے۔

معیار انسانیت | انسان ایک لحاظ سے حیوان ہے اور دوسرے لحاظ سے فرشتہ یعنی اس میں کچھ تو حیوانی صفات پائی جاتی ہیں جو اس کے جسمانی مظاہر سے تعلق رکھتی ہیں اور کچھ روحانی امور بھی، جنہیں بروئے کار لاکر وہ فرشتوں کی صف میں داخل ہو جاتا ہے۔ ان دونوں میں توازن اور مساوات ہی کا نام انسانیت ہے۔ جب تک کسی شخص میں یہ دونوں صفات برابر برابر موجود رہتی ہیں، اس کی آدمیت بھی متوازن و برقرار رہتی ہے۔ مگر جب یہ توازن بگڑ جاتا ہے اور افراط و تفریط رونما ہونے لگتی ہے تو پہلی صورت میں حیوانیت و فحاشی کا ظہور ہوتا ہے، عریاں تہذیب کے کرشمے رونما ہوتے ہیں۔ اور انانیت و خود غرضی کے شگوفے کھلتے ہیں۔ اور دوسری صورت میں رہبانیت یا تمدن ہنگامہ آرائیوں سے کنارہ کشی جنم لیتی ہے۔

لہٰذا ایک انسان کو مکمل انسان بننے کیلئے حیوانی مظاہر اور ملکوتی خصائل یا اخلاق حسنہ میں کامل توازن برقرار رکھنا ضروری ہے۔ یہی اسلام کی تعلیم اور دین فطرت کا خلاصہ و جوہر ہے۔

اس کی تعلیم تمام انبیائے کرام دیتے رہے ہیں۔ اور اس میں سارے عالم انسانی کی فلاح و کامران مضمر ہے ۔ —— یہ جسم و روح یا دین و دنیا کا حسین امتزاج اور وہ جامع و متوازن نقطۂ نظر ہے۔ جس کی مثال دنیا کے کسی دوسرے مذہب میں نہیں ملتی۔

ان لربك عليك حقا ، ولنفسك عليك حقاً ، ولاهلك عليك حقاً ، فاعط كل ذي حق حقه : یقیناً تمہارے رب کا بھی تم پر حق ہے ، تمہارے نفس کا بھی تم پر حق ہے اور تمہارے اہل وعیال کا بھی تم پر حق ہے۔ پس تم ہر ایک حقدار کو اس کا حق ادا کرو (بخاری)

■■

حضرت میاں عبدالحکیم کاکڑ علیہ الرحمۃ

(وفات ۱۱۵۳ھ)

مغربی پاکستان کے نامی گرامی مشائخ جنہوں نے اپنی پاکیزہ زندگی اور تبلیغی کارناموں سے ہمارے اس خطہ میں چمنستان اسلام کی آبیاری کی ہے، اور ان کی مجاہدانہ سرگرمیوں کی یادیں اب ہمارے قلب اور روح کی خوابیدہ طاقتوں کو جگانے، گرمانے اور سرگرم عمل رکھنے کیلئے ایک بڑا ذریعہ ہیں، ان مشائخ عظام کے گروہ میں حضرت مولانا شیخ میاں عبدالحکیم کاکڑ علیہ الرحمۃ کا نام نامی قابل ذکر ہے۔ جن کا مزار مبارک کوئٹہ ڈویژن کے ضلع لورالائی کے موضع چوٹیالی میں واقع ہے، جسے گمبتی کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ مغربی پاکستان کے مشہور قبیلہ ترین کے قبائلی سردار آپ کے مزار مبارک کی مجاوری کی خدمات بجالانا اپنی سعادت سمجھتے ہیں۔ اور آج کل بھی یہی قبائلی سردار یہ فریضہ ادا کر رہے ہیں۔

"تاریخ سلطانی" (طبع بمبئی ۱۲۹۸ھ) میں آپ کے ابتدائی حالات کی ضمن میں یہ مختصر تذکرہ درج کیا گیا ہے کہ:

"حضرت ایشان (میاں عبدالحکیم) اپنے زمانہ کے جلیل القدر بزرگ تھے۔ علماء اور مشائخ کے گروہ میں آپ کو مقبولیت کا مقام حاصل تھا۔ خاص اور عام کا مرجع اور کافۂ انام کے مرشد تھے۔ اصل میں آپ قبیلۂ کاکڑ سے تعلق رکھتے تھے۔ جو مورث اعلیٰ غرغشت کا ایک ذیلی شاخ ہے۔ بچپن میں تحصیل علوم اور تکمیل فنون کی طرف توجہ دی۔ چونکہ فطری فطانت اور جبلی لیاقت رکھتے تھے۔ تھوڑے ہی عرصے میں درجہ فضیلت اور کمال حاصل کیا۔ طبیعت بندگی اور عبادت خالق کی طرف مائل تھی جب عبادت سے فارغ ہو جاتے تو مختلف علوم کی کتابوں کے مطالعہ میں مشغول ہو جاتے اور کوشش کرتے کہ مختلف علوم مباحث اور فنون میں پوری مہارت آپ کو حاصل ہو جائے۔ ایک ایک لمحہ کو ضائع نہ جانے دیتے۔ آپ نے تکلیفیں

اٹھائیں۔ کوششیں کیں۔ یہاں تک کہ تھوڑا سا زمانہ بھی نہ گذرنے پایا تھا کہ علم صرف کے اشتقاقات۔ علم نحو کے قواعد۔ علم منطق کے قوانین اور علم حکمت کے آئین اور نکات میں اور علم بدیع، علم معانی اور علم بیان میں اور علم اصول اور میزان حدیث میں اور علم تفسیر کے دلائل اور علم فقہ کے مسائل قواعد اور احکام میں اور علم کلام کے فوائد میں اپنے زمانہ کے فاضل علماء کے استاد تسلیم کئے گئے۔ اس کے بعد آپ نے مجاز سے آگے بڑھ کر حقیقت تک رسائی حاصل کی طریقت اور معرفت کے سلسلہ میں بیعت حاصل کی۔ اور تھوڑے سے عرصہ میں طریقت اور معرفت کے اسرار اور رموز بھی حل کئے۔ اور اپنے ہمعصروں سے اس میدان میں بھی گوئے سبقت حاصل کی۔ بیت ؎

مرد بہ ہمت ز ملک بگذرد ہمت عالی ز فلک بگذرد

اپنے پیرِ طریقت کی طرف سے آپ کو خرقہ خلافت اور بیعت و ارشاد کی اجازت ملکر ماذون بنا دیئے گئے۔ بہت سے لوگوں کی ایک بڑی جماعت کو مرید بنایا اور اپنے لطائف شیریں سے شہر بھر میں آپ کا غلغلہ بلند ہوا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چاروں طرف سے لوگوں کا ایک سیلاب امڈ آیا۔ کیا کامل اور عالم اور کیا جاہل۔ کیا خواص اور عوام آپ کی خانقاہ پر لوگوں کا تانتا بندھ گیا۔ اور آپ کی دعوت اور ارشاد سے لوگ نجات کی منزل تک راہ پانے میں کامیاب ہونے لگے۔ اور جب آپ سے مخلوق خدا کی عقیدت بہت بڑھ گئی۔ اور آپ کے مریدین اور معتقدین کی تعداد ہزاروں لاکھوں تک پہنچ گئی۔ تو بعض ناعاقبت اندیش اور کور باطن حاسدوں نے اس وقت کے حکمران سلطان شاہ حسین غلزائے (والئ قندہار) کے کان بھرنے شروع کئے۔ اسے برافروختہ کر دیا۔ اور نتیجہ میں دربار شاہی سے حکم صادر ہوا کہ حضرت میاں عبدالحکیم شہر قندہار سے نکل جائیں۔" (فارسی سے ترجمہ)

تاریخ سلطانی کے اس مختصر بیان کے علاوہ حضرت میاں عبدالحکیم علیہ الرحمۃ کے حالات کے سلسلہ میں کوئی تفصیلی بیان کسی تذکرہ میں موجود نہیں تھا۔ اس لئے کافی تلاش اور تحقیق کے بعد جو معلومات ہاتھ آسکی ہیں وہ یہاں درج کی جاتی ہیں۔ تاکہ مغربی پاکستان کے اس جلیل القدر بزرگ کے مزید حالات اگر کسی کے پاس ہوں وہ ان پر اضافہ کر سکیں۔ اور اس طرح ہم اپنے نامور اسلاف کی قابلِ فخر زندگیوں

اور ان کے کارناموں سے باخبر ہو سکیں۔

حضرت میاں عبدالحکیم علیہ الرحمۃ کے والد ماجد کا نام میاں سکندر شاہ ہے۔ اور آپ قوم غرغشت کے ذیلی شاخ کاکڑ کے ذیلی شاخ سنٹیھا کے ذیلی شاخ ڈیوڈزہی کے ذیلی شاخ شموزی سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس قبیلہ کے لوگ تحصیل پشین ضلع کوئٹہ میں آباد ہیں۔ ان کے چند ایک دیہات سب تحصیل خانوزائے کے قریب شرقاً اور جنوباً پہاڑی کے دامنوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ کچھ تو زراعت پیشہ ہیں۔ اور کچھ مویشی پالکر زندگی بسر کرتے ہیں۔ آثار سے ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ حضرت میاں عبدالحکیم علیہ الرحمۃ کے والد ماجد مویشی پالکر زندگی گذارتے تھے۔ مغربی پاکستان کے تمام قبائلی علاقوں کی ایک بہت بڑی اکثریت کے لوگوں کا یہی پیشہ ہے۔ کیونکہ قابل کاشت زمین اور زراعتی وسائل کی کمی کے پیش نظر ماضی میں ان لوگوں کیلئے مویشی پالنے کے بغیر کوئی دوسرا سہارا ہی نہیں تھا۔ اور ویسے بھی یہ ایک معزز اور شریف پیشہ ہے۔ فارسی کا ایک شعر ہے ؎

بحکم آنکہ امت پروری را   شبان لائق بود پیغمبری را

حضرت میاں عبدالحکیم علیہ الرحمۃ کے والد ماجد کی سکونت موضع خانوزائے میں تھی۔ اور یہاں وفات پاکر مدفون ہوئے۔ یہاں کے مقامی علماء کی روایت ہے کہ میاں عبدالحکیم علیہ الرحمۃ کے والد ماجد نے کافی بڑی عمر تک پہنچنے کے بعد شادی کی تھی۔ حضرت میاں صاحب کی والدہ نیک اور صالح بی بی تھیں۔ آپ نے خواب دیکھا کہ آپ کے بدن سے سورج کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں، جنہیں آپ نے اپنے کپڑوں میں سمیٹ لیا اور چھپا لیا۔ اس پر حضرت میاں عبدالحکیم صاحب کے نانا صاحب نے جو ایک بہت بڑے عالم اور خدا رسیدہ بزرگ تھے۔ اس خواب کی یہ تعبیر بیان کی۔ کہ میری لڑکی کو خداوند عالم ایک ایسا فرزند عطا کریگا۔ کہ دنیا جہاں اس کے علوم ظاہری اور باطنی کے انوار سے روشن ہو جائے گا۔ اور آپ کی یہ تعبیر حرف بحرف پوری ہوگئی۔

آپ کی ولادت کا زمانہ تاریخی شواہد اور آثار کو دیکھتے ہوئے ۱۱۰۰ھ متعین کیا جا سکتا ہے۔ آپ کی ولادت کے کچھ ہی عرصہ بعد آپ کی والدہ ماجدہ وفات پاگئیں۔ باپ کی کوئی اور اولاد نہیں تھی۔ اس لئے دوسری شادی کی۔ لیکن اس دوسری بیوی کی اولاد کا کچھ پتہ نہیں لگتا۔ جب میاں صاحب تعلیم حاصل کرنے کے قابل ہوئے تو استاد کے پاس بٹھائے گئے۔ لیکن سوتیلی ماں کا سلوک ان کے ساتھ اچھا نہیں تھا۔ ہمیشہ مارا کرتی۔ اور تکلیف پہنچاتی رہتی جس سے تنگ آکر حضرت میاں صاحب گھر سے نکل پڑے۔ علوم دین کی تحصیل کیلئے روانہ ہوگئے۔ اور مسافرت کی سختیاں جھیلتے

ہوئے مروّجہ علوم کی تحصیل میں کامیابی حاصل کی۔
ابتدائی تعلیم آپ نے کاکڑ کے علاقہ میں حاصل کی۔ اور اسکی تکمیل کے سلسلہ میں افغانستان کے علاقہ جات قندہار اور ننگرہار اور مغربی پاکستان کے علاقہ پشاور کی مسافرتیں برداشت کیں علوم طریقت اور معرفت میں آپ کا سب سے پہلا استاد اور پیرِ طریقت میاں سید لعل محمد جیہ ننگرہاری علیہ الرحمۃ تھے جن سے آپ نے طریقت اور سلوک کی ابتدائی منازل طے کرنے کی تربیت حاصل کی۔ اور جب حضرت شیخ میاں سید لعل محمد نے حضرت میاں عبدالحکیم کی حالت پر توجہ کی اور ان کے شوق کی زیادتی۔ اور ساتھ ہی وسعتِ قلب اور حوصلہ کا اندازہ لگایا تو انہوں نے اپنے اس سعادتمند شاگرد اور مرید کو حضرت شیخ حافظ میاں عبدالغفور کشمیری، پشاوری کی خدمت میں بمقام پشاور بھیجا ــــــ

حضرت شیخ حافظ عبدالغفور نقشبندی مجدّدی مغربی پاکستان کے ان جلیل القدر بزرگوں اور مشائخ عظام میں سے ہیں، جو خطہ جنّت نظیر کشمیر میں پیدا ہوئے۔ مغربی پاکستان کے دارالحکومت لاہور میں آپ نے روحانی تربیت حاصل کی۔ اور وادی پشاور کے مرکزی مقام پشاور شہر میں قیام فرماکر اپنے فیوضات کے سرچشمہ سے ایک عالم کو سیراب کیا۔ آپ کے عرفانی اور روحانی بلند مرتبہ کا اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ کہ حضرت غوث العالم میاں محمد عمر چمکنی اور حضرت قطب العالم شاہ محمد غوث قادری لاہوری آپ ہی کے شاگردوں میں سے ہیں۔ حضرت میاں عبدالحکیم علیہ الرحمۃ اپنے شیخ اور استاد حضرت میاں سید لعل محمد ننگرہاری کی ہدایت کے مطابق ان ہی حضرت مولانا شیخ عبدالغفور پشاوری سے فیض حاصل کرنے کیلئے تشریف لائے تھے۔
حضرت شیخ حافظ عبدالغفور پشاوری نے از راہِ شفقت مزید فیوضات کے حصول اور کمالات باطنی کی تکمیل کیلئے میاں عبدالحکیم کو اپنے استاذ اور شیخ طریقت مولانا اللہ یار صاحب لاہوری کی خدمت میں لاہور بھیجا۔ اور یہاں آکر آپ نے دریائے معرفت کے اس جلیل القدر ناخدا سے فیضان اور سیرابی حاصل کی۔ درجہ کمال تک پہنچے۔ اور اس طرح کوئٹہ، قندہار، ننگرہار، پشاور، اور لاہور کے روحانی اور عرفانی مراکز سے فیوضات حاصل کرنے والا یہ فرزند ارجمند ایک جلیل القدر بزرگ کی حیثیت سے مہر درخشاں بنکر مغربی پاکستان کا آفتاب عالمتاب بنا۔
آپ کے طریقت کے مشائخ پر ایک نظر ڈالئے تو آپ کے ابتدائی پیرِ طریقت ہیں۔
حضرت شیخ میاں سید لعل محمد ننگرہاری ہیں جو کہ حضرت شیخ حافظ عبدالغفور کشمیری پشاوری کے خلیفہ

ہیں۔ اور دوسرے مرحلہ پر آپ نے حضرت شیخ عبدالغفور علیہ الرحمۃ سے براہ راست بھی فیض حاصل کیا ہے۔ حضرت شیخ حافظ عبدالغفور کشمیری پشاوری کو سلسلہ عالیہ نقشبندیہ میں حضرت مولانا پدر بزرگوار شیخ سعدی بخاری لاہوری علیہ الرحمۃ سے خرقہ خلافت حاصل ہوا تھا۔ حضرت شیخ سعدیؒ کا اصل نام محمد سعید تھا۔ چونکہ آپ اپنے پیر طریقت حضرت سیدنا آدم بنوری علیہ الرحمۃ کے محبوب ترین خلفاء میں سے تھے۔ یہاں تک کہ آپ نے اپنے فرزندوں کی بیعت اور تربیت کا کام بھی آپ کے حوالہ کیا تھا۔ اس لئے محبت اور شفقت کے طور پر آپ کو شیخ سعدی لاہوری کے نام سے یاد فرماتے۔ حضرت شیخ سعدی لاہوری بروز چار شنبہ بتاریخ ۱۳ ربیع الثانی ۱۱۰۸ھ بمقام لاہور فوت ہوئے ہیں۔ آپ کا مزار مبارک شہر لاہور کے علاقہ مزنگ میں واقع ہے۔ یہاں کا سعدی پارک آپ ہی کے نام نامی کی طرف منسوب ہے۔ آپ کا تفصیلی تذکرہ مفتی غلام سرور لاہوری نے اپنی تالیف خزینۃ الاصفیاء۔ میں۔ حضرت شیخ غوث العالم میاں محمد عمر چمکنی پشاوری نے اپنی تالیف سر الاسرار میں اور مولانا محمد امین بدخشی کی تالیف "تاریخ بدخشی" میں درج ہے۔ اور حضرت مولانا شیخ حافظ عبدالغفور کشمیری، پشاوری کا تفصیلی تذکرہ میاں محمد عمر چمکنی پشاوری کی تالیف سر الاسرار حضرت شاہ محمد غوث قادری، گیلانی لاہوری کی تالیف "روضۃ السلام" اور "مقدمہ شرح صحیح بخاری" میں۔ اور "تذکرۃ الاولیاء ہند" (طبع دہلی) میں درج ہے۔ آپ بتاریخ ۱۴ شعبان المعظم ۱۱۱۶ھ وفات ہوئے۔ مزار مبارک پشاور چھاؤنی میں تھانہ شرقی کے قریب واقع ہے۔ اور مرجع خاص و عام ہے۔

حضرت میاں عبدالحکیم علیہ الرحمۃ کے شریعت اور طریقت کے اساتذہ اور مشائخ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو سب سے زیادہ فیض حضرت مولانا شیخ حافظ عبدالغفور کشمیری علیہ الرحمۃ سے ملا ہے۔ اور حضرت شیخ حافظ عبدالغفور کو اپنے پیر طریقت حضرت شیخ سعدی لاہوری علیہ الرحمۃ سے تذکرہ اولیائے ہند۔ (ص ۱۱۳) کی روایت کے مطابق طریقت کے چاروں سلسلوں قادری، چشتی، نقشبندی، سہروردی میں خرقہ خلافت حاصل تھا۔ لیکن اسی روایت کے ساتھ ہی جب ہم ان کی زندگی پر نظر ڈالتے ہیں تو واضح ہو جاتا ہے۔ کہ آپ کو خصوصیت کے ساتھ سلسلۂ عالیہ نقشبندیہ اور سلسلہ عالیہ قادریہ میں خصوصی نسبت حاصل تھی، طریقت اور تصوف کی اصطلاح میں نسبت اس کو کہتے ہیں کہ کسی بزرگ پر کسی خاص سلسلہ کے احوال اور مقامات کا غلبہ ہو جائے اور اسکی پوری زندگی اسی سلسلہ کے مشائخ کے رنگ میں رنگی جائے۔ حضرت شیخ عبدالغفور

پشاوری علیہ الرحمۃ کو قادریہ اور نقشبندیہ سلکوں میں نسبت حاصل ہونے سے مراد یہ ہے کہ آپ کی پوری زندگی حضرت شیخ المشائخ غوث صمدانی، قطب ربانی، محبوب سبحانی شیخ عبدالقادر جیلانی علیہ الرحمۃ اور حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی علیہ الرحمۃ کے رنگ میں رنگی ہوئی تھی۔ اور ظاہر ہے کہ ان دونوں مشائخ عظام نے اپنی پوری زندگی احیائے دین، اجرائے شریعت، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کیلئے وقف کر رکھی تھی۔ اور اسی کے پیش نظر حضرت شیخ عبدالغفور علیہ الرحمۃ جہاں اپنے مریدوں کو طریقہ عالیہ نقشبندیہ کے اصول کے مطابق تزکیۂ نفس کی تعلیم دیتے اور ان کی تربیت فرماتے۔ وہاں پشاور شہر کے آس پاس اور دور دراز مقامات میں تبلیغ اور تعلیم اسلام کیلئے جاتے۔ امر معروف فرماتے۔ نہی عن المنکر کیلئے کام کرتے۔ اور اسلام کی سربلندی کیلئے کوشش فرماتے۔ اور یہی وہ روحانی تعلیم اور تربیت تھی جو خصوصیت کے ساتھ میاں عبدالحکیم کاکڑ علیہ الرحمۃ کو آپ کی ذات گرامی سے حاصل ہوئی۔

حضرت میاں عبدالحکیم کاکڑ علیہ الرحمۃ اپنے مشائخ طریقت سے خرقہ خلافت حاصل کرنے کے بعد قندہار جانے اور وہاں علوم اسلامی کی درس و تدریس اشاعت اور تبلیغ کیلئے تشریف لے گئے۔ یہاں آکر آپ نے علوم شریعت کا درس دینے کے علاوہ وعظ اور تبلیغ کا سلسلہ بھی جاری کیا۔ مختصر مدت میں قندہار کی سرزمین کو علم کی روشنی سے منور کیا۔ اور بہت سے بے علم لوگ آپ کی تعلیم اور تربیت سے علم اور عرفان کے بلند منازل تک پہنچ گئے۔ آپ کے وعظ اور تقریروں میں اثر اور جاذبیت کا یہ عالم تھا کہ جو کوئی اسے سن لیتا، وہ برے کاموں سے توبہ کر لیتا۔ گناہوں سے باز آجاتا۔ اور اسے نیکی، نیکوکاری اور دینداری کی سعادت حاصل ہو جاتی۔ آپ کی تشریف آوری سے قندہار بقعۂ نور بن گیا۔

آپ جب قندہار تشریف لائے تھے، اس وقت حاجی میرویس خان ہوتک کی حکومت تھی۔ اسکی وفات کے بعد ان کے بھائی عبدالعزیز خان بادشاہ ہوئے۔ اور جب ان کا دور حکومت بھی ختم ہو گیا، تو حاجی میرویس خان کا فرزند شاہ حسین قندہار کا بادشاہ اور حکمران بنا۔ اس نئے حکمران کے تعلقات حضرت میاں عبدالحکیم علیہ الرحمۃ سے کشیدہ ہو گئے۔ تعلقات کشیدہ ہونے کی جو وجوہات بیان کی جاتی ہیں۔ اس سلسلہ میں تاریخ خورشید جہاں "تاریخ سلطانی" اور "تذکرہ اولیائے ہند" کی روایتوں کے علاوہ مقامی روایات میں حد درجہ اختلاف پایا جاتا ہے۔ لیکن اس ایک بات پر سب کا اتفاق ہے۔ کہ شاہ حسین حکمران قندہار نے حکم دیا کہ حضرت میاں عبدالحکیم قدس سرہٗ قندہار شہر چھوڑ کر نکل جائیں۔ چنانچہ حضرت میاں صاحب علیہ الرحمۃ اپنے بیشمار شاگردوں اور مریدین کے ساتھ قندہار سے ہجرت کر گئے۔ جس سے اہلیان قندہار کو شدید روحانی صدمہ پہنچا۔ درو دیوار سے رونے کی صدائیں نکل آئیں۔

اس وقت کے شاعروں نے بڑے دردناک الفاظ میں اس سانحہ کو نظم کیا ہے۔ اور ایک روایت جو بہت ہی عام ہے۔ یہ ہے کہ حضرت میاں عبدالحکیم علیہ الرحمۃ کو قندہار سے جلاوطن کرانے کے کچھ ہی دنوں بعد شاہ حسین ہوتک کی حکومت کا تختہ الٹ گیا۔ اور وہ بے کسی کی موت مارا گیا۔ ایک شاعر نے درج ذیل شعر میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے ؎

میاں صاحب چہ ویوست شاہ حسین لہ دغے خارہ
غرق یئے پاچھی شوہ دَ اولیا نو لہ گفتارہ

ترجمہ: شاہ حسین نے جب اس شہر سے میاں صاحب کو نکال دیا۔ تو اولیاء اللہ کی بددعا سے اس کی بادشاہی کا بیڑا غرق ہو گیا۔

حضرت شیخ المشائخ میاں عبدالحکیم ۱۱۴۶ھ میں قندہار شہر سے نکل آئے تھے۔ قندہار سے نکلتے وقت ہزاروں معتقدین اور مریدین کی ایک بڑی جمعیت آپ کے ساتھ نکل آئی۔ آپ نے شہر سے باہر پہنچ کر ان کو نصیحت کی کہ وہ اپنے اپنے گھروں کو واپس ہوں۔ بہتوں کو واپس بھیجا۔ لیکن جو لوگ کسی حالت میں بھی آپ سے جدا ہونا گوارا نہیں کرتے تھے۔ ان کی جمعیت کو ساتھ لیکر اپنے آبائی مقام خانوزائے (کوئٹہ) تشریف لے آئے۔ آپ کے والد ماجد فوت ہو چکے تھے۔ ان کے مزار کو پختہ بنوایا۔ اور ساتھ ہی ایک مسجد اور باغ بھی بنوایا۔ تقریباً ایک سال یہاں قیام کرنے کے بعد پہاڑی سلسلوں کو عبور کرنا شروع کیا۔ اور مواضعات یوسف کَچ، کھواس، بغاو، سملن، بورے، اور سنگ سے ہوتے ہوئے موضع چوٹیالی پہنچے۔ اور یہاں سکونت اختیار کی۔ اور اپنی زندگی کے آخری چھ سالوں کا عرصہ یہاں گذارا۔ اور بالآخر ۱۱۵۳ھ میں وفات پا گئے۔ علیہ الرحمۃ والغفران۔

خدا بہتر جانتا ہے کہ حضرت شیخ میاں عبدالحکیم علیہ الرحمۃ کو رنج اور آزار پہنچانے کی وجہ سے یا کسی دوسرے سبب سے تھوڑے عرصہ کے گذرنے کے بعد ۱۱۴۹ء میں (یعنی حضرت میاں صاحب کو جلاوطن کرنے کے تین سال بعد) قندہار پر نادر شاہ افشار نے حملہ کیا۔ اور شہر کو فتح کرتے ہوئے اس نے سلطان شاہ حسین ہوتک کو اس کے شاہی خاندان کے تمام افراد کے ساتھ پکڑ کر مملکت ایران کے صوبہ مازندران میں قید کر ڈالا۔ اور بعد میں وہیں بصد خواری اور ذلت مروا ڈالا۔ نادر شاہ افشار نے قندہار کا قدیمی شہر مسمار کر دیا۔ جو اب تک ویران پڑا ہوا ہے۔ اس کے کھنڈرات مرثیہ خوانی کر رہے ہیں، شاہ حسین ہوتک سر بفلک محل "قصر نارنج" آج مٹی کا ایک تودہ ہے۔ لیکن حضرت میاں عبدالحکیم علیہ الرحمۃ کی مسجد اور خانقاہ (زیر زمین تہ خانہ) آج بھی تر و تازہ اور صحیح اور سلامت ہیں۔

اور آج بھی ہزاروں لوگ ہر جمعہ اور جمعرات کے دن اس کی زیارت کیلئے جاتے ہیں۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے ؎

بجزائے حسن عمل بین کہ روزگار ہنوز خراب می نکند بارگاہ کسریٰ را

روایت ہے کہ ایک دن حضرت شیخ المشائخ میاں عبدالحکیم علیہ الرحمۃ شہر قندھار کے کسی بازار میں جا رہے تھے کہ سامنے سے ایک نوجوان (احمد شاہ ابدالی) آتے دکھائی دئیے۔ میاں صاحب نے اُسے پاس بلالیا۔ اس کے حق میں دعا فرمائی۔ اور پھر رخصت کیا۔ ساتھیوں کے استفسار پہ فرمایا کہ یہ بہت ہی نیک بخت نوجوان ہے اسکی پیشانی میں بادشاہی کی نشانیاں نظر آرہی ہیں۔ اور آپ کا یہ فرمانا درست ثابت ہوا۔ حضرت میاں صاحب کی وفات ۱۱۵۳ھ کے سات سال بعد ۱۱۶۰ھ میں یہ نوجوان غازی احمد شاہ ابدالی فاتح پانی پت کے نام سے ایک مجاہد سلطان بن گیا تھا۔ علیہم الرحمۃ والغفران ـــــ۔

حضرت میاں عبدالحکیم علیہ الرحمۃ کی ظاہری اولاد کوئی بھی باقی نہیں رہی۔ لیکن آپ کی روحانی اولاد کی تعداد لاکھوں سے بھی زیادہ ہے۔ آپ کے خلفاء میں سے حضرت نور محمد جیو درانی قندھاری علیہ الرحمۃ کا نام نامی قابلِ ذکر ہے۔ اس کے علاوہ آپ کی یادگار آپ کی مختلف تالیفات ہیں۔ جو خصوصیت کے ساتھ علم عقائد اور علم تصوف کے موضوع پہ بلند پایہ محققانہ تالیفات ہیں۔ ذیل میں ان کی تالیفات کا مختصراً تذکرہ درج کیا جاتا ہے۔

۱۔ حصن الایمان ۔ یہ فارسی زبان میں ہے۔ اس میں علم عقائد کے مسائل روان اور سادہ لفظوں میں استدلالی مگر تعلیمی طریقہ سے بیان کئے گئے ہیں۔ بعد میں خود آپ نے اپنی اس مبسوط کتاب کا ایک خلاصہ "مختصر حصن الایمان" کے نام سے تحریر کیا ہے۔ اس مختصر کتاب کا ایک قلمی نسخہ جو حضرت میاں صاحب کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا۔ مجھے شہر لاہور کے ایک تاجر کتب سے مل گیا تھا۔ جسے میں نے قیمتاً خرید کر اسے علمی تحفہ کے طور پر پشتو اکاڈیمی پشاور کو مفت نذر کیا۔ یہی نسخہ ۱۳۷۲ھ میں حافظ خان محمد مرحوم تاجر کتب کوئٹہ کے اہتمام اور فاضلانہ دیباچہ کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔

۲۔ مجموعہ رسائل ۔ اس مجموعہ میں چھ عدد رسائل ہیں۔ جو علم تصوف کے مختلف موضوعات کے متعلق ہیں۔ اور ان میں تصوف کے مختلف طریقوں کے ابتداء، اصول اور طریقۂ تزکیہ، تنزیہہ، فیوض، حقیقت صلوٰۃ، حقیقت فقر، حقیقت محمدی، نفی اور اثبات کے مباحث کو نہایت ہی محققانہ انداز میں تحریر کیا ہے۔ ان میں خصوصیت کے ساتھ رسالہ نمبر ۵ میں ان علوم اور معارف

کا تذکرہ ہے۔ جو آپ کو حضرت میاں میر سید لعل ننگرہاری ابن حضرت سید حبیب علیہ الرحمۃ سے حاصل ہوئی ہیں۔ اور رسالہ نمبر۶ میں ان علوم اور معارف کا تذکرہ ہے۔ جو آپ کو حضرت مولانا میاں حافظ اللہ یار لاہوری علیہ الرحمۃ سے حاصل ہوئے تھے۔ اس رسالہ میں شریعت، طریقت، اور حقیقت تینوں کے موضوع پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ اور یہ کتاب پانچ فصلوں پر مشتمل ہے۔ فصل اوّل دربیان اذکار و وظائف۔ فصل دوئم دربیان نفی واثبات۔ فصل سوئم دربیان تنزیہات۔ فصل چہارم دربیان فیوضات۔ فصل پنجم دربیان سفرذات ومراتب سیر طریقت۔

آپ کی تالیفات کے اس مختصر تعارف سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کو علوم ظاہری اور باطنی میں بلند مرتبہ حاصل تھا۔ اور آپ نے اپنی تالیفات کے ذریعہ اپنے فیوضات کے سلسلہ کو زندگی دوام بخشی ہے۔

جیساکہ پہلے ذکر کیا گیا ہے۔ کوئٹہ ڈویژن کے نامور قبیلہ ترین کے قبائلی سردار آپ کے مزار مبارک کے مجاور ہیں۔ اور مجاور ہونے کی یہ خدمت اپنے لئے موجب خیر و برکت سمجھتے ہیں۔ کوئٹہ ڈویژن اور قبیلہ ترین کا نامور قبائلی سردار جناب حاجی صورت خان ترین نے سینتیس ہزار ۳۷۰۰۰ روپیہ کی لاگت سے حضرت میاں عبدالحکیم علیہ الرحمۃ کا مزار مبارک تعمیر کیا ہے۔ اور گذشتہ ۲۳ سال سے اس مبارک خانقاہ کے لنگرخانہ کا تمام سالانہ خرچ یعنی بارہ سو بوری گندم اور مبلغ بارہ سو روپیہ نقد کے اخراجات بھی برداشت کر رہے ہیں۔ اور اس اعتبار سے حضرت میاں عبدالحکیم کاکڑ علیہ الرحمۃ نقشبندی مجددی کو ترین قبیلہ کے خصوصی پیشوا کی حیثیت حاصل ہے۔ جبکہ آپ کے فیوضات کا دائرہ پورے پاکستان کیلئے بھی عام ہے۔

■■

جناب حکیم محمد سعید صاحب
(ہمدرد)

ہمدرد قوم کے نکاتِ عشرہ

امداد بیرونی اور غیروں کی دست نگری ہماری قومی حمیّت اور حریت کے لئے سمِّ قاتل ہے۔ ہمیں ہر قربانی دے کر اور ہر قسم کا ایثار کر کے اس سے نجات حاصل کرنی چاہئے۔ اور کاسۂ گدائی کو توڑ کر اپنے پیروں پر کھڑا ہونا چاہئے۔ اپنے ذرائع و ذخائر پر تکیہ کرنا چاہئے اور خود کفالتی کے لئے ہر ممکن کوشش کرنی چاہئے اور اپنی خود داری کی حفاظت کرنی چاہئے۔

اس منزل تک پہنچنے کے لئے میں نے دس نکات (نکاتِ عشرہ) پیش کئے ہیں:

۱۔ صحت و تعلیم ایک ملّت کی سب سے اہم تہذیبی ضرورتیں ہیں۔ صحت کے مسائل کو حل کرنے کے لئے اور ہر خاص و عام کو علاج کی سہولتیں بہم پہنچانے کے لئے قومی ذرائع کو پوری طرح کام میں لایا جائے اور بیرونی ذرائع پر انحصار کم و کم تر کیا جائے۔ تعلیم کے باب میں اب تک جو غلطیاں ہوئی ہیں۔ اور جن کے جو مہلک اثرات و نتائج سامنے آ چکے ہیں، ان سے پورا سبق لیا جائے۔ تعلیم کو بامقصد ہونا چاہئے اور اسے نظریہ پاکستان اور تقاضہ ہائے ملتِ اسلامیہ پاکستانیہ سے ہم آہنگ ہونا چاہئے۔ تعلیم ایک ملت کا سب سے اہم اور سنگین مسئلہ ہے۔ اور پاکستان کے برسرِ اقتدار لوگ اسے آج تک حل کر کے پُر مقصد بنانے میں قطعی ناکام ہو چکے ہیں۔ ہم ان پر اب اعتماد نہیں کر سکتے۔ ایک ماہرینِ تعلیم کا بورڈ بنایا جائے جو اعلاء اقدارِ انسانی اور اصولِ اسلامی کی روشنی میں ایک صحت مند نصابِ تعلیم مرتب کرے اور اسے نافذ کرے۔ تعلیم کو مرکزی حکومت کے نظام کے تحت ہونا چاہئے۔

۲۔ ہر شعبۂ زندگی میں سادگی اختیار کی جائے۔ زندگی کی حقیقی ضروریات بہت کم ہیں۔ طمطراق اور نمائش کے جذبات کی ہمّت شکنی کی جائے اور سادگی کو اعلا مقام دیا جائے ــــ کفایت اور بچت کی عادت ڈالی جائے اور اس کوشش کو باہمی تعاون سے کامیاب بنایا جائے۔ ہر موقع اور ہر سطح پر سادگی اور کفایت کو مدِنظر رکھا جائے۔ جب کفایت کا لفظ بولا جاتا ہے تو اس میں وقت کی کفایت بھی شریک ہے۔ وقت اور قوت کو مفید کاموں میں لگایا جائے۔

۳- معاشرے اخلاقی برائیاں، خصوصاً رشوت، کام چوری، فرض شناسی، عشرت پسندی، نمود و نمائش، سہل انگاری وغیرہ ختم کرنے کے لئے خواتین کو تیار کیا جائے۔ خواتین بڑا اہم کردار ادا کر سکتی ہیں۔ ایک پرامن، پرسکون، دیانت دار، فرض شناس معاشرے کے فوائد و فیوض کو تمام ذرائع اشاعت و اطلاعات استعمال کر کے قوم کے ذہن نشین کرایا جائے، تاکہ اس معاشرے کو قائم و دائم کرنے کے لئے موجودہ عادتوں کو ترک کرنے اور اچھی عادتیں اختیار کرنے کی ترغیب و تشویق ہو۔

۴- ایک قومی لباس کو اپنایا جائے۔ سادگی اور کفایت کو پیشِ نظر رکھ کر قومی لباس منتخب کیا جائے۔ تاکہ ظاہری اونچ نیچ ختم ہو۔ جہاں تک ممکن ہو سادہ سوتی اور خاکی لباس کو اپنایا جائے۔ قومی لباس کا تعین کرنے کے لئے ایک قومی کمیٹی تشکیل دی جائے، جس میں ہر صوبے اور ہر طبقے کے نمائندے شامل ہوں۔ اور کام کی ابتدا کرنے کے لئے سب سے پہلے پاکستان کے تمام تعلیمی اداروں کے طلبہ و طالبات کے لئے خاکی لباس وضع و اختیار کیا جائے۔ اور رفتہ رفتہ اُسے پورے ملک کا لباس قرار دے دیا جائے۔

۵- تعیشات (LUXURIES) کی درآمد قطعاً بند کر دی جائے، جس میں کچھ مدت کے لئے کاروں کو بھی شامل کیا جائے۔ اس کی بجائے چھوٹی بڑی بسیں برآمد کر کے آمد و رفت کو سہل و سستا بنایا جائے۔ اور عوام کو مصیبت اور ضیاعِ وقت سے بچایا جائے۔ نہ صرف یہ بلکہ ایسی اشیاء جن کے لئے ہم غیروں کے دست نگر ہیں اور جن کے بغیر ہم زندہ رہ سکتے ہیں، ان کا استعمال ترک کر دیا جائے۔ یہ اشیاء خواہ درآمد کی جائیں یا غیر ہمارے ہاں بنائیں، مگر ان کا منافع باہر چلا جائے، ہماری معیشت کے لئے تباہ کن ہے، ان کو ترک کر دیا جائے۔ اس کے برعکس ہمیں اپنی ضرورتوں کو کم کرنا چاہئے۔ اور اپنی حقیقی ضرورتوں کے لئے اپنی صنعت و حرفت کو ترقی دینی چاہیئے۔

۶- الف :- محنت کی عزت کی جائے، اور محنتی افراد کی قدر کی جائے، اور اسطرح ملت کے ہر فرد کو محنت پسند بنایا جائے۔ آرام طلبی اور سہولت پسندی ہمارا قومی مزاج نہیں ہو سکتی — ہمارا نصب العین ہونا چاہیئے۔ "محنت میں راحت و عزت ہے"

ب :- قوم میں مخلص اور دانش مند اور صاحب فکر و نظر افراد کی کمی نہیں ہے۔ قدر دانی کے ذریعے ان کی صلاحیتوں کو اجاگر ہونے اور قوم کے کام آنے کا موقع دیا جائے۔

۷- دولت مندوں کے لئے محلات اور حویلیاں بنانا ممنوع قرار دیا جائے۔ ایک درمیانی رقم متعین کر کے اس سے زیادہ مصارف سے مکانات کی تعمیر کو روک دیا جائے۔ اس سے زیادہ صرف کر کے

کوئی مکان بنانا چاہے تو اس شخص سے زیادہ رقم کے مساوی رقم محنت کشوں کے مکانات کے لئے وصول کی جائے اور موجودہ عالی شان مکانات کو درس گاہوں اور بچوں کی تربیت گاہوں میں تبدیل کیا جائے۔ اور ان درسگاہوں اور تربیت گاہوں کے اخراجات کا کفیل ان ہی کو بنایا جائے ، جن کے یہ مکانات ہیں۔

۸۔ ملاوٹ ، کم تولنے ، بددیانتی کے لئے سخت ترین قانونی سزا کے علاوہ معاشرتی دباؤ کے ذریعے بھی کام لیا جائے۔ ملاوٹ کے مجرموں کو نہ قانون اور حکومت معاف کرے اور نہ عوام اور اس معاملے میں عوام پوری اخلاقی جرأت کا ثبوت دیکر ملاوٹ کرنے والوں ، ملاوٹی چیزیں بیچنے والوں اور اس میں معاون سرکاری عملے کے لئے رکاوٹ بنیں۔

۹۔ ذہن کو پراگندہ ، اخلاق کو تباہ اور صحت کو خراب کرنے والے تمام ذرائع کا سدّباب کیا جائے۔ اس کے برعکس صحیح تربیب ، اچھے کردار اور اعلا صحت کے اصولوں کی اشاعت کی جائے۔ غیر ملکی فلموں اور ثقافتی مظاہروں ، فیشن شوز اور حُسن کے مقابلوں کو بند کر کے اپنی تہذیب و ثقافت کی ترویج کی راہیں ہموار کی جائیں۔ عمل سے دور کرنے والی چیزوں کی بجائے آمادۂ عمل کرنے والے ذرائع اختیار کئے جائیں ــــــ

۱۰۔ نوجوانوں کے جوش و خروش کو ایک فالِ نیک قرار دیا جائے اور اس کو تعمیری رخ دیا جائے۔ اور اُن کے سامنے اصلاح و تعمیر ملت کا ایک واضح پروگرام رکھ کر ان کی قوتوں اور توانائیوں کو صحیح راستے پر لایا جائے اور آنے والے وقت کی عظیم ذمّے داریوں کو قبول کرنے اور سنبھالنے کے لئے ان کو تیار کیا جائے۔ طلبہ و طالبات کو سیاسی مقاصد کے لئے آلۂ کار بنانے کو جرم قرار دیا جائے۔

مفتاح کنوز السنتہ مؤلف : الدکتور۔ الف۔ جی۔ ونسنک۔ مترجم : محمد فواد عبدالباقی
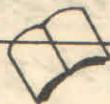
ناشر : سہیل اکیڈمی ۲۲ شاہ عالم مارکیٹ لاہور۔ قیمت مجلد ۳۶/ روپے صفحات ۵۵۲۔

علماء اسلام نے احادیث کی مشہور کتابوں کی تخریج پر ابتداء ہی سے مختلف انواع کی فہرستیں مرتب کیں کسی نے صحاح ستہ کی احادیث کو اوائل واطراف کی ترتیب سے کسی نے ایک ایک راوی کی تمام روایات کو کسی نے صحابہؓ کے نام پر حروف تہجی کے لحاظ سے یہ خدمت انجام دی اسی سلسلہ میں مسانید اور معاجم کا ایک ذخیرہ اسلامی علوم میں مطبوعہ اور غیر مطبوعہ شکل میں پایا جاتا ہے۔ مگر یہ دور جو علمی ترقی کا ہے۔ سائنٹفک انداز میں آسان طریقہ سے نئے انداز میں جمع و ترتیب کا متقاضی تھا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ کام ایک ہالینڈی مستشرق ونسنک سے لیا جنہوں نے نہایت محنت اور عرقریزی سے چودہ اہم اور متداول کتابوں کا انڈکس تیار کیا۔ مصر کے ایک ممتاز مصنف محمد فواد عبدالباقی نے اس فہرست کو مفتاح کے نام سے نہ صرف عربی جامہ پہنایا بلکہ بقول علامہ رشید رضا مرحوم، کتاب کو تتبع و تلاش اور احاطہ کے لحاظ سے انگریزی اصل سے بھی زیادہ نافع بنا دیا۔ مصنف نے صحیح بخاری، سنن ابی داؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، دارمی، کے احادیث کی فہرست کتاب اور ابواب کے نمبرات کے لحاظ سے اور صحیح مسلم، موطا مالک، مسند زید بن علی، مسند ابوداؤد طیالسی کو حدیث کے نمبرات اور مسند احمد بن حنبل طبقات ابن سعد، سیرت ابن ہشام اور مغازی واقدی کو صفحات کتاب کے لحاظ سے مرتب کیا ہے۔ نمونہ کے لئے ملاحظہ ہو :

احتجاج آدم موسیٰ۔ بخاری کتاب ۶۰ باب ۳۱ کتاب ۶۵ باب ۱، ۳ کتاب ۸۲ باب ۱۱۔ الخ مسلم کتاب ۴۶ حدیث ۱۳، ۱۵ ابوداؤد کتاب ۳۹ باب ۱۶۔ ترمذی کتاب ۳۰ باب ۲۔ ابن ماجہ المقدمہ باب ۱۰۔ موطا مالک کتاب ۴۶ حدیث ۱۔ مسند احمد بن حنبل جلد ۲ ص ۲۴۸، ص ۲۶۴، ص ۲۸۷، ص ۳۱۴ الخ

موخر الذکر (صفحات والی) کتابیں عموماً ایک ہی دفعہ چھپی ہیں اور ہمارے ہاں بھی اکثر وہی نسخے پائے جاتے ہیں جو انڈکس تیار کرتے وقت پیش نظر رہے۔ (اگر چہ بعض کتابیں مثلاً طبقات دوبارہ بھی

چھپ چکی ہے) البتہ پہلی اور دوسری قسم کی کتابیں ہمارے ہاں عموماً بغیر نمبرات ابواب و احادیث کے متداول ہیں۔ اس خامی کو اہلِ تحقیق و اربابِ ذوق اپنے مخصوص نسخوں پہ نمبرات لگوانے کی معمولی محنت اٹھا کر دور کر سکتے ہیں۔ مستشرقین بلاشبہ مخصوص اغراض کے تحت اسلامی علوم سے اتنا شغف رکھتے ہیں مگر اس میں شک نہیں کہ اس "شر" کے پہلو سے علمی لحاظ سے مسلمانوں کے لئے بہت بڑی "خیر" کا سامان بھی پیدا ہو گیا ہے۔ ایسے اہم اور عظیم الشان علمی کام اس دور کے مسلمانوں کے کرنے کے تھے۔ پھر یہ دور جتنا کام اور محنت کا محتاج تھا اتنا ہی اللہ نے اسباب اور وسائل مہیا فرما دئے۔ مگر بدقسمتی سے ہمتیں اور ولولے اتنی ہی پست ہو چکی ہیں۔ ایک وقت تھا کہ برصغیر خاص طور پر حدیثی خدمات میں پیش پیش تھا۔ اسی کتاب کے مقدمہ میں علامہ رشید رضا مرحوم کا مشہور جملہ ہے کہ ولولا عناية اخواننا علماء الهند بعلوم الحديث في هذا العصر لقضى عليها بالزوال من امصار الشرق ۔۔۔ علمائے عرب سے خراج تحسین پانے والی علمار ہند کی اس جماعت میں علماء دیوبند کا حصہ سب سے زیادہ ہے۔ (جس کا اعتراف انہوں نے دارالعلوم دیوبند آکر خود بھی کیا)

بہرحال مفتاح کی اشاعت وقت کی عظیم الشان خدمت ہے۔ تحقیق و تصنیف اور تخریج و مراجعت احادیث کرنے والے حضرات کو اسکی مدد سے مذکورہ تمام اہم کتابوں کے حوالے بڑی آسانی سے مل سکتے ہیں اور ایک متلاشی بڑی کد و کاوش سے بچ جاتا ہے۔ ۳۰ سال قبل جب یہ کتاب شائع ہوئی تو مصر کے ایک ممتاز محدث اور مصنف علامہ احمد محمد شاکرؒ نے بجا طور پر کہا تھا کہ اگر ایسی کتاب پہلے سے میرے سامنے آگئی ہوتی تو میری علمی اور تصنیفی عمر کا نصف حصہ بچ جاتا، جو مراجعت کتب میں صرف ہوا۔

سہیل اکیڈمی لاہور نے اس کتاب کو مصری نسخہ سے لیکر شائع کیا ہے۔ اکیڈمی اس اہم خدمت پر پورے علمی طبقہ سے خراج تحسین اور حوصلہ افزائی کی مستحق ہے۔ ۔۔۔ سکالر، محقق، محدث، مدرس، کے علاوہ قانون دان، وکلاء اور جج حضرات بھی اس سے بہت فائدہ اٹھا سکیں گے۔ کتاب کی طباعت، کاغذ، جلد ہر لحاظ سے معیاری ہے۔ مگر قیمت قدرے گران ہے۔ خدا کرے یہ اہم خدمت سہیل اکیڈمی کے لئے مستقبل میں عظیم الشان خدمات کا پیش خیمہ ثابت ہو ۔۔۔

ماہنامہ محدث | مقام اشاعت: مدرسہ رحمانیہ گارڈن ٹاؤن لاہور۔ مدیر: حافظ عبدالرحمن روپڑی۔
صفحات ۴۸ - فی پرچہ ۹۰ پیسے۔ سالانہ چندہ دس روپے۔ ۔۔۔ مجلسِ ادارت کا تعلق اہلحدیث مکتبِ فکر سے ہے۔ پرچہ تحقیقی اور غیر معاندانہ انداز میں اصلاحی اور علمی مضامین پر مشتمل ہوتا ہے۔ کچھ

مضامین مخصوص فقہی مسلک کے ترجمان ہوتے ہیں اور بعض میں وقت کے دینی فتنوں کا بھی مؤثر انداز میں محاسبہ ہو رہا ہے۔ مثلاً اشتراکی مغالطے اور ان کا دفعیہ اور سیرتِ رسول کریمؐ و مستشرقین، حدیث کے بغیر قرآن فہمی مشکل ہے۔ تحریر و ترتیب دلکش اور شگفتہ ہے۔ معیارِ طباعت اور کاغذ عمدہ مگر ۸۰ صفحات میں سالانہ چندہ اس معیار کے دیگر رسائل سے قدرے زیادہ ہے۔ معزز معاصر کے اعلیٰ سے اعلیٰ معیار تک پہنچنے اور خدمتِ دین کی توفیق کی دعا ہے۔

ماہنامہ الارشاد ادارت: مولانا قاضی محمد زاہد الحسینی صاحب۔ دار الارشاد جامعہ مدنیہ کیمبل پور سالانہ چندہ ۸/ روپے، فی پرچہ ۷۵ پیسے۔ ——— محترم مولانا قاضی محمد زاہد الحسینی صاحب دین کی خدمت میں شب و روز مصروف رہتے ہیں۔ قرآن کریم کی درس و تدریس ان کا محبوب مشغلہ ہے۔ پیشِ نظر پرچہ الارشاد اپریل اور مئی کا مشترکہ شمارہ ہے۔ صفحات ۶۴ ہیں پرچہ کے مندرجات زیادہ تر حضرت قاضی صاحب کے درس قرآن و حدیث خطبات جمعہ و مجالس ذکر پر مشتمل ہیں۔ امید ہے آپکے عام فہم اندازِ بیان کے لحاظ سے عام مسلمانوں کو عموماً اور حضرت قاضی صاحب کے حلقۂ احباب و ادارت کو خصوصاً اس پرچہ سے بڑا فائدہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ الارشاد کو مسلمانوں کے رشد و ہدایت کا ایک بہتر ذریعہ بنا دے ——

اسلامی مساوات مولانا محمد حفیظ اللہ پھلواری۔ صفحات ۱۶۰۔ قیمت ۳/ روپے ناشر ادارۂ تحقیق و تصنیف ۱ے - ۴/۱۷ - ان۔ نارتھ ناظم آباد کراچی ۳۳ ——— اسلامی مساوات کے نام پر جس سوشلزم کا ہنگامہ برپا ہے وہ ایک اصطلاحی فریب کے سوا اور کچھ نہیں۔ اسلام نے بیشک مساوات اور عدل و انصاف کا ایک بے مثال تصور اور نمونہ پیش کیا تاریخ جس کی نظیر سے قاصر ہے۔ مگر وہ مساوات زیادہ تر اخلاقی اور معاشرتی تھی۔ جو خود بخود معاشی ایثار و مؤاسات کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ مگر مساوات کا موجودہ تصور (معاشی اور اقتصادی لحاظ سے بنی نوع انسان کی برابری اور تاریخ کی مادی تعبیر) یہ اس لفظ سے ایک ظالمانہ مذاق ہے۔ مرتب کتاب مولانا حفیظ اللہ پھلواری پرانے اہل قلم ہیں اور قارئین الحق ان کے نگارشات سے واقف ہیں۔ پیش نظر کتابچہ میں بڑی محنت اور عرقریزی سے اسلام کے نہ صرف تصور مساوات کو اجاگر کیا گیا ہے۔ بلکہ عملی طور پر حضورؐ اور خلفاء راشدین اور صحابہ کرامؓ نے اس کے جو نمونے پیش کئے ان کی تصویر بھی بڑی جامع اور مختصر انداز میں پیش کی ہے۔ جس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اسلام نے قانون، معاشرت، تعلیم، معاش، حقوق ہر چیز میں تمام انسانوں کو استحقاقی لحاظ سے برابر کا حق دیا ہے۔ فضیلت صرف اکتسابی ہے جو کسب سعی اور عمل پر مبنی ہے۔ کتاب کا

تیسرا ایڈیشن اس کی مقبولیت کی دلیل ہے۔ ہم اس اہم خدمت پر فاضل مصنف کو ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہیں۔

عطیۂ پاکستان | مرتبہ مولانا ابو احمد عبد اللہ صاحب ۔ صفحات ۳۰۴ ۔ قیمت نامعلوم ناشر عبد الواسع ۔ ناظم دار العلوم نعمانیہ گوجرانوالہ ـــــ کتاب کا مقصد پورے نام "سربراہان مملکت اسلامیہ اور مجاہدین اسلام کیلئے عطیۂ پاکستان" سے کچھ واضح ہو جاتا ہے۔ دعوت و تبلیغ، وعظ و نصیحت کے ضمن میں بہت سی مفید معلومات اور نکات بھی آگئے ہیں، جہاد، عبادات، قوانین شرعیہ وغیرہ امور پر موثر انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ ■■

کوائف مدارس عربیہ مغربی پاکستان

ملک کے ہر سکول کالج بلکہ کارخانے اور فیکٹری کے بھی حالات مل جاتے ہیں، لیکن دینی مراکز مدارس عربیہ کے بارہ میں کسی قسم کی معلومات کہیں سے نہیں ملتی ہیں۔ اس بنیادی ضرورت کو پورا کرنے کیلئے مسلم اکاڈمی، محمد نگر، لاہور کیطرف سے ایک ضخیم کتاب مرتب کی جارہی ہے۔ اس میں مغربی پاکستان کے تمام دینی مدارس کے حالات جمع کئے جارہے ہیں، خواہ ان کا تعلق کسی بھی مکتبِ فکر سے ہو۔ جملہ دار العلوم اور مکاتب و مدارس کے مہتمم حضرات سے اپیل کی جاتی ہے کہ وہ مطلوبہ کوائف مہیا فرمائیں۔

(حافظ نذر احمد جنرل سیکرٹری مسلم اکاڈمی، محمد نگر، علامہ اقبال روڈ ـــــ لاہور)

ایک اہم سلسلہ مضامین

علمی اور فکری زندگی کا نچوڑ

علمی اور مطالعاتی کاموں میں رہنمائی، علمی ذوق و شوق، صحتمند مطالعہ اور تصنیف و تالیف کے جذبات ابھارنا، عالم اسلام کو درپیش مسائل اور ان کا حل اور اسلامی دنیا کے علمی اور فکری فتنوں کا تعاقب، الحق کے مقاصد میں سے ہے۔ ـــــ اس سلسلہ میں الحق نے ایک سوالنامہ کی شکل میں ملک و بیرون ملک کے چیدہ چیدہ اہل علم، مصنفین، مشائخ اور قدیم و جدید علوم کے مفکرین کو اپنی علمی تدریسی، کتابی اور اکتسابی زندگی کے بارہ میں نقوش و تاثرات پیش کرنے اور موجودہ عالم اسلام کے مسائل اور جدید نظریات کے بارہ میں اپنی علمی اور مطالعاتی زندگی کا نچوڑ پیش کرنے کی دعوت دی ہے۔ اس سلسلہ میں بہت سے حضرات کی طرف سے سوالنامہ کے جوابات آنے شروع ہوگئے ہیں۔ انشاء اللہ علمی زندگی کیلئے یہ ولولہ انگیز سلسلہ مضامین اگلے ماہ سے شروع ہوگا۔

(ادارۂ الحق)